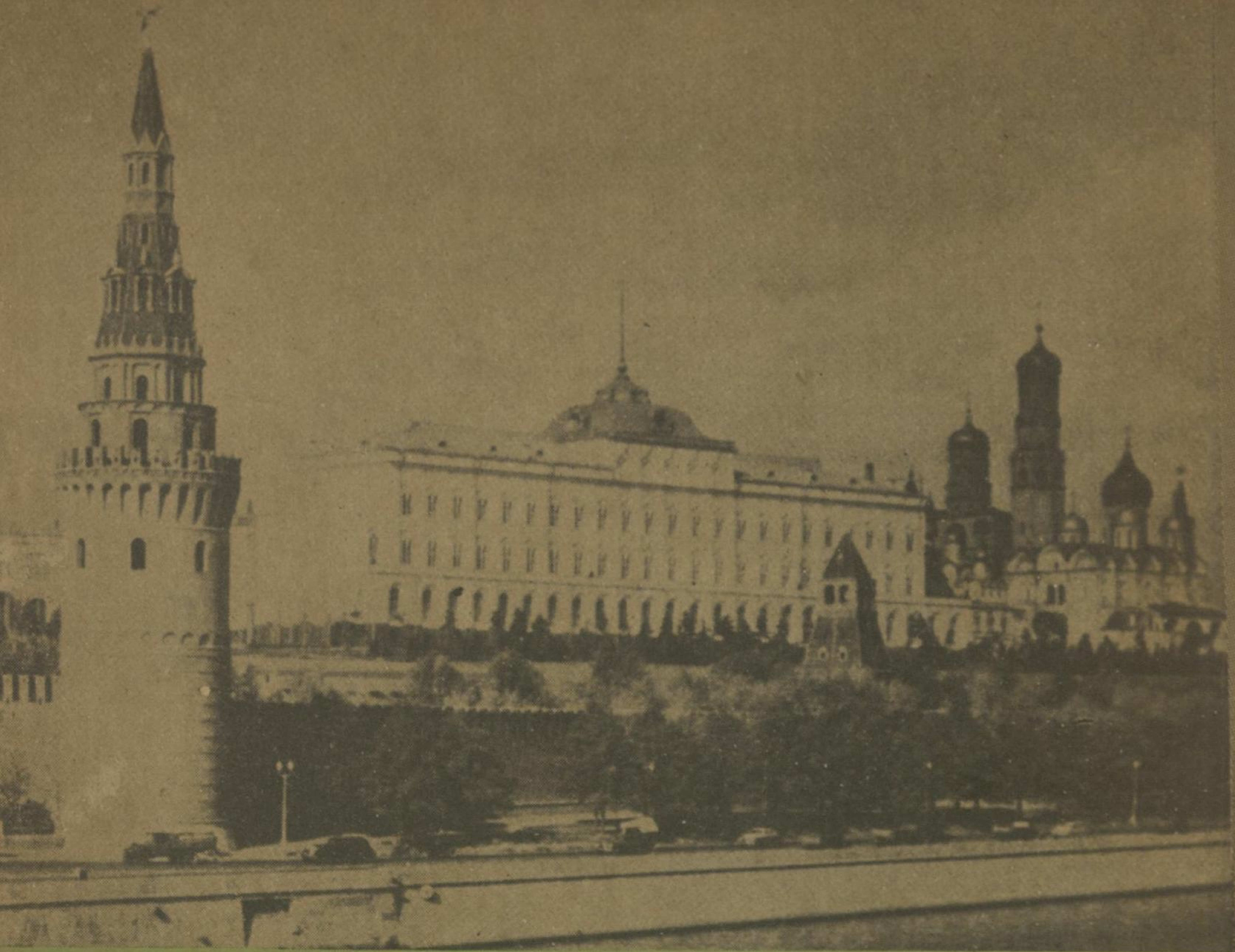


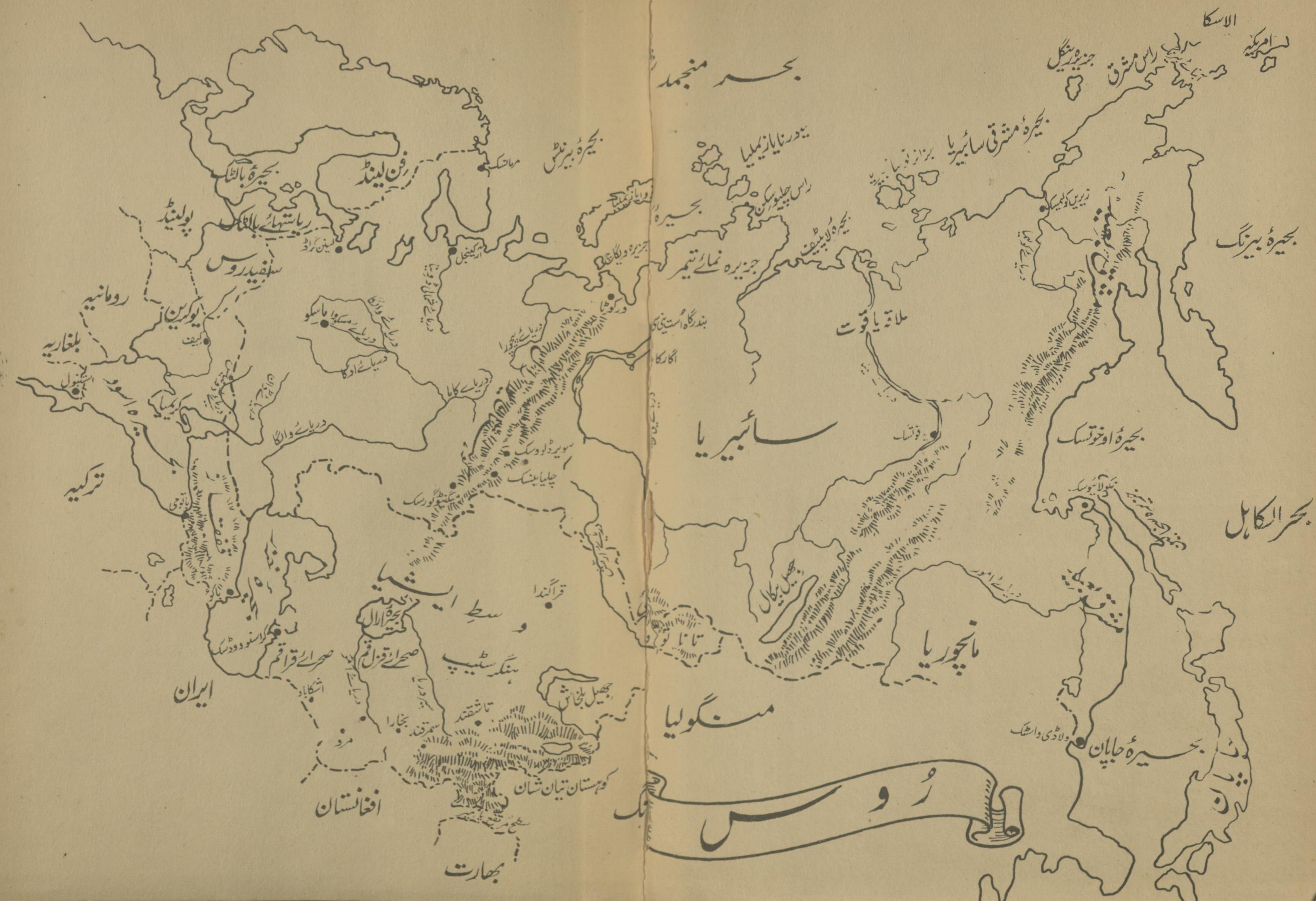
سرزمین اور باشندے

روس

تصنیف
الیگزینڈر نزاروف

ترجمہ
ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ـــ پشاور ـــ حیدرآباد ـــ کراچی



روس
بحر منجمد
الاسکا
امریکہ
راس مشرق
جزیرہ بیرنگ
بحیرۂ بیرنگ
بحیرۂ مشرقی سائبیریا
بحیرۂ اوخوتسک
بحرالکاہل
بحیرۂ جاپان
ولاڈی واسٹک
علاقۂ یاقوت
سائبیریا
جھیل بیکال
مانچوریا
منگولیا
تانا تووا
جزیرہ نمائے تیمیر
بحیرۂ بیرنٹس
فن لینڈ
بحیرۂ بالٹک
ریاستہائے بالٹک
پولینڈ
سفید روس
یوکرین
ماسکو
رومانیہ
بلغاریہ
ترکیہ
ایران
افغانستان
بھارت
وسط ایشیا
قراگندا
بحیرۂ ارال
صحرائے قزل قم
صحرائے قراقم
ہنگر سٹیپ
جھیل بلخاش
تاشقند
سمرقند
بخارا
مرو
کوہستان تیان شان

سرزمین اور باشندے

روس

مصنفہ : ——— الیگزنڈر نزراف

مترجمہ : ——— ڈاکٹر مس خدیجہ فیروزالدین

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ——— حیدرآباد ——— کراچی

This is an authorized Urdu translation of
THE LAND OF THE RUSSIAN PEOPLE
by Alexander Nazaroff.

Published by J. B. Lippincott Company,
Philadelphia and New York.

FIRST URDU EDITION

PRINTED IN PAKISTAN

طبع اوّل ———— ۱۹۶۸ء
تعداد ———— ۲۱۰۰
طابع ———— شیخ نیاز احمد
مطبع ———— علمی پرنٹنگ پریس
قیمت ———— سات روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، ادبی مارکیٹ چوک اردو بازار۔ لاہور

بہ اشتراک

مؤسسۂ مطبوعات فرینکلن لاہور۔ نیویارک

ترتیب

عرضِ حال

(ڈاکٹر مس خدیجہ فیروز الدین)

میں دُنیا میں آنے والی معصوم روحوں کی تربیت کے لیے ماحول کو بڑی اہمیت دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایک درویش منش اور علم دوست خاندان میں بھیج کر خاص رحمت کی۔ یہاں ہر وقت اللہ کا نام تھا اور "کتابیں اپنے آباء کی"

میرے والدِ محترم محمدؐ فیروز الدین خان سابق صوبۂ سرحد میں محکمۂ تعلیمات کے ممتاز افسر رہے۔ بلوچستان اور حیدر آباد دکن نے بھی اُن سے تعلیمی فیض حاصل کیا۔

میری تعلیم گاہیں غیر ملکی قیادت کے انگریزی سکول تھے کیونکہ مُسلمان بچیوں کے لیے معیاری درس گاہیں آج بھی ناپید ہیں۔

کنیرڈ کالج لاہور سے میں نے ریاضی اور تاریخ کے مضامین سے ایف۔ اے پاس کیا۔ مجھے یونیورسٹی کا وظیفہ ملا۔ کنیرڈ کالج والے مجھے گرجا جانے پر مجبور کرتے تھے اور مَیں نہ مانتی تھی۔ اس پر انھوں نے مجھے بی۔ اے میں داخل کرنے سے انکار کر دیا اور میرا وظیفہ ضائع ہو گیا۔ یہاں سے انکار ہوا تو کانوینٹ نے مجھے خوش آمدید کہی اور وہاں میں نے ایف۔ اے کے مضامین جاری رکھ کر بی۔ اے آنرز کیا۔ پھر تاریخ کا مضمون لے کر ۱۹۲۲ء میں بطور پرائیویٹ امیدوار امتحان ایم۔ اے میں شامل ہوئی اور پنجاب یونیورسٹی میں دوسرا نمبر حاصل کیا۔ میں اس یونیورسٹی کی پہلی ایم۔ اے خاتون اور برعظیم پاک و بھارت کی پہلی مُسلمان ایم۔ اے تھی۔

دو سال بعد ایم۔ او۔ ایل (ماسٹر آف اورینٹل لرننگ) پاس کیا اور یونیورسٹی میں

اوّل آنے پر خلیفہ محمدؐ حسین جوبلی گولڈ میڈل کی حقدار بنی - یہ امتحان باقاعدہ طور پر میں نے ہی پاس کیا ہے - یہ اعزازی ڈپلوما نہیں -

میرا پسندیدہ مضمون ریاضی تھا مگر تاریخی جستجو کا بھی شوق تھا - اس لیے قدیم ہندوستان کی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے میں نے سنسکرت پڑھی اور پنچ تنتر، بھگوت گیتا، شکنتلا ناٹک، سانکھ شاستر، یوگ شاستر اور کسی قدر رگ وید کا مطالعہ کیا - گیتا بہت کچھ زبانی یاد کی - پھر ہندی اور گورمکھی سے رشتہ جوڑا - گورونانک صاحب کا جپ جی، جاپ صاحب اور سکھ منی صاحب پڑھے اور بعض دفعہ افسوس ہوا کہ ان بزرگ کے نام لیوا شِشّ (سکھ) جاپ صاحب کو بہت کم سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں عربی، فارسی الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں - پشتو زبان کے لٹریچر سے بھی میں نے اپنے تحقیقی کام میں بہت استفادہ کیا -

محکمہ تعلیمات پنجاب کی پیش کش بہ حیثیتِ پروفیسر تاریخ السنہ شرقیہ "لاہور کالج" منظور کی اور پھر مختلف درس گاہوں میں کام کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں مجھے ڈپٹی ڈائرکٹرس آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے فرائض سپرد ہوئے - اسی عہدے سے میں پنشن لینے تک وابستہ رہی -

۱۹۴۱ء میں میں نے تاریخ کی اعلیٰ ڈاکٹریٹ یعنی ڈی - لٹ کی ڈگری حاصل کی - یونیورسٹی کا یہ اعزاز خواتین میں ابھی تک صرف ان سطور کی راقمہ ہی کے حصّے میں آیا ہے - دورانِ ملازمت میں اور مابعد میں نے ہمالیہ سے لے کر راس کماری اور لنکا تک کا سفر کیا -

ان سیّاحتوں کا مقصد تاریخی مقامات اور لائبریریوں میں قلمی نسخے دیکھنا اور بعض اوقات خواتین کی کانفرنسوں اور دوسری عالمی مجالس میں شمولیت یا قیادت تھا -

۱۹۴۰ء میں بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا اور حرمینِ شریفین کی زیارت سے بہرہ ور ہوئی - بعدازاں دو مرتبہ یورپ جانا ہوا اور ایمسٹرڈم (ہالینڈ)، ڈنمارک، ماسکو، وارسا، بدخشی (پولینڈ) اور مشہور ہئیت دان کوپرنیکس کے وطن شہر ٹاؤرن میں خواتین کی کانفرنسوں میں شرکت

کی اور مشترکہ اجتماعات کو خطاب کیا۔

۱۹۶۰ء میں رُوس کی تاجیک، ترک اور اُزبک جمہوریتوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہاں اجتماعات میں انگریزی اور فارسی زبانوں میں حسبِ ضرورت اظہارِ خیالات کیا۔ ماسکو میں ترکمان رقبے کی خوبصورت مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ وہ بھی کیا سماں تھا جب ترکمان بہنوں کے ساتھ میری جبینِ نیاز بارگاہِ ایزدی میں جھکی تھی۔

میرے کانوں نے وہاں عربی میں اذان سُنی، قرأت سُنی، امام کا خطبہ سُنا اور دل نے کہا کہ رسُولِ عربی صلّی اللہ علیہ وسلم کا کتنا احسان ہے کہ نماز صرف ایک زبان یعنی عربی میں رائج کی۔

سیاحت رُوس کے حالات سب سے پہلے میں نے لکھے اور پہلی بار "آہنی پردے" کے اس پار کے کچھ مناظر دکھائے۔ یہ اقدام خود میرے لیے شجرِ ممنوعہ کی تلخیاں رکھتا تھا۔ لیکن مجھے ایک گونہ اطمینان تھا کہ کبھی نہ کبھی پاکستان اور رُوس کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں میری یہ سیاحت اور مضامین پہلی کڑی ثابت ہوں گے۔ اور شاید قوم اس کا اعتراف بھی کرے۔

پھر مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور نے "دی لینڈ آف دی رشین پیپل" کے اُردو ترجمے کا کام مجھے سونپا تو اپنی علمی تہی مایگی کا احساس رکھتے ہوئے بھی میں نے یہ ذمّہ داری اس بناء پر قبول کر لی کہ شاید اس کی کڑی میرے پہلے مضامین کی کڑی سے جا ملے اور قوم کے لیے مفید ثابت ہو۔

یکم جون ۱۹۶۷ء - لاہور

پیش لفظ

"روسیوں کی سرزمین" ملک روس کی تاریخ پر الیگزنڈر نزراف کی طائرانہ نگاہ ہے جس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں چھپا ہے۔

یہ کتاب قارئین کو روس کے پُر آشوب ماضی اور انقلابی حال کا مختصر مرقّع پیش کرتی ہے۔

پُرانے زمانے میں روس ایک ملک نہ تھا بلکہ اس وسیع رقبے میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کے حکمراں بہت کم چین سے بیٹھتے تھے۔ کسی ہمسایہ رئیس کو کمزور پاتے ہی وہ اس پر چڑھ دوڑتے تھے۔ یہ انتشار بیرونی حملہ آوروں اور ہنگامی قسمت آزماؤں کے لیے کھلا دعوت نامہ تھا اور اسی کے جواب میں چنگیز خاں، وہ غیر مُسلم منگول جس نے مہذّب اور منظم اسلامی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کیا، سمرقند و بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجائی، علوم و فنون کے خزانے بے دردی سے خاک سیاہ کر ڈالے یہاں ایک بگولے کی طرح آن نازل ہُوا۔ اس نے قیام تو نہ کیا مگر اس اقدام سے اس کے جانشینوں کو اپنی امارتیں قائم کرنے کا خوب موقع ملا۔ روس ڈھائی سو سال تک تاتاریوں کے قبضۂ اقتدار میں رہا۔ کہیں سولہویں صدی کے آغاز میں جا کر ڈیوک آئیوان سوم ان تمام علاقوں کو تاتاریوں کی گرفت سے آزاد کرانے میں کامیاب ہُوا اور اس کی وسیع و عریض ولایت نے "عظیم ریاست مسکوویا" نام پایا۔

پھر زمانے نے ایسی کروٹ لی کہ تیمور کی وسط ایشائی سلطنت بھی پارہ پارہ ہوگئی۔

اس کتاب کا فاضل مصنّف قدرے ملال کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور سیاسی ولولے جن کے زیرِ اثر ترکمانوں، ازبکوں اور کرغیزیوں نے کبھی حیرت انگیز معرکے سر کیے تھے ختم ہو گئے۔ اُن پر بے حسی کی نیند طاری ہو گئی اور نتیجہ یہ ہُوا کہ ۸۴-۱۸۶۸ء کے درمیانی عرصہ میں رُوسی حکومت نے ان تمام مملکتوں اور ریاستوں کو حکمت عملی سے فتح کر لیا۔

پھر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد رُوس کے نئے نظام کی قیادت میں جو علمی اور سائنسی ارتقاء ہُوا اس کا وہ کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے۔ البتہ اشتراکیت کے اقتصادی نظام کی کامیابی کے متعلق اس کی رائے مذبذب ہے۔ وہ اہلِ رُوس کی فعالیّت، سخت کوشی، علمیت اور محنت کا قائل ہے۔ مگر اُسے وہاں جمہوریت کی وہ آزادی نظر نہیں آتی جس میں متعدّد پارٹیاں جہد للبقاء کی سعی کر سکیں۔ بہت ممکن ہے اس کی یہ رائے اشتراکی نظام سے نظریاتی اختلاف پر مبنی ہو۔

وہ ایک حقیقت شناس اور دقیقہ رس سیّاح کی حیثیت سے نقائص کو ہر ملک و ملّت کا عام عیب سمجھ کر سرسری حوالے دیتا ہے۔ لیکن قدرتی مناظر، جغرافیائی خدّوخال، مواصلات اور سیّاحت میں پیش آنے والے کوائف اور واقعات کی ایسی واضح قلمی تصویر کھینچتا ہے کہ ہر نقش واضح ہو کر سیّاحوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

اہلِ پاکستان کے لیے یہ کتاب بالخصوص باعثِ کشش ہو گی۔ کیونکہ پہلی عالمی جنگ کے وقت جب ترکی کے مراسم رُوس سے منقطع ہو گئے تو برّصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کو اس ملک سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ لیکن جونہی وسط ایشیائی ترکستان کی جمہوریتیں یکے بعد دیگرے رُوس کے ساتھ الحاق کرنے لگیں تو دلوں میں تجسّس نے پھر کروٹ لی۔ مگر تسکین کی سب راہیں مسدود نظر آئیں۔ اغیار کی حکومت نے اس جذبے کو دبانے کے لیے روس کا جغرافیہ تک جو پہلے یہاں کے مدارس میں پڑھایا جاتا تھا نصاب سے نکال دیا اور جب پاکستان بنا تو اِسے اپنے اور رُوس کے مابین واقعی ایک آہنی پردہ نظر آیا۔ لیکن اب ایک قرن

کے بعد دونوں ملکوں میں ثقافتی اور تجارتی روابط قائم ہو گئے ہیں ۔ فضائیہ کے طیارے دہلی جائے بغیر کراچی سے سید ھے اُڑ کر رُوس پہنچتے ہیں ۔

اور بایقین یہاں کے لوگ وقتاً فوقتاً کاروبار ، تلاشِ علم ، سیّاحی اور اُزبک ، تاجیک ، ترکمان ، کرغیز وغیرہ جمہوریتوں کے باسیوں کو ایک نگاہ دیکھ لینے کی آرزو میں رُوس آتے ہیں ۔ لہٰذا کتابِ ہٰذا کا مطالعہ اس نوعیت کی سیّاحت کے آرزو مند پاکستانیوں کے لیے معلومات افزاء اور مفید ثابت ہو گا اور یہ چند اوراق انھیں رُوس کی مختصر تاریخ ، وجہِ تسمیہ ، جغرافیائی اور معاشرتی ماحول ، علمی اور صنعتی ترقی سے باخبر کرتے ہوئے مرکزی ایشیائی مسلمانوں کی اس مُلک سے وابستگی کے اسباب بھی سمجھا دیں گے ۔

ڈاکٹر (مس) خدیجہ فیروز الدّین

لاہور مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۶۷ء

سائبیریا کی زندگی

سان فرانسسکو سے بحرالکاہل پار کرکے آپ کا جہاز ولاڈی واسٹک کی بندرگاہ میں پہنچتا ہے۔ آپ ایک نئی دُنیا یعنی رُوسیوں کی سرزمین میں ہیں جسے "متحدہ سوویٹ اشتراکی جمہوریتیں" یا مختصراً سوویٹ یونین کہتے ہیں۔

اس عریض وعمیق خلیج سے جہاں آپ کا جہاز داخل ہؤا ہے نگاہ ڈالیں تو خوبصورت ولاڈی واسٹک نظروں میں کھُب جاتا ہے۔ سبز درختوں کے درمیان سفید مکانوں کے جھُنڈ قوس کی شکل میں اُن پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے ہیں جن کی ڈھلانیں سمندر تک پہنچتی ہیں موسمِ بہار میں یہ پہاڑیاں سُرخ وسفید اور رنگا رنگ کے پھولوں سے اس طرح پٹ جاتی ہیں کہ اس کی مثال دنیا میں کم مقامات پیش کر سکتے ہیں۔ آپ کے چاروں طرف خلیج میں کاروبار کا ہنگامہ ہے۔ جہازوں میں سامان لادنے اور اتارنے کے لیے جرِّثقیل کھڑکھڑاتی
پھرتی ہیں۔ بحری جہازوں، مال برداروں اور سوویٹ بحریہ کے لنگر انداز تباہ کن جہازوں 9
کے علاوہ لاتعداد طرح طرح کی ماہی گیر کشتیاں ہر طرف پھرتی نظر آتی ہیں۔ ولاڈی واسٹک ماہی گیری کا بڑا مرکز ہے۔ اس سے ذرا دُور سبزی مائل نیلے رنگ کے پانی میں مچھلیاں، دریائی بچھڑے اور ویل مچھلیاں بھری پڑی ہیں۔ شہر کی فضا میں ہر وقت مچھلی، گلی سڑی سمندری جڑی بوٹیوں اور تارکول کی بُو بسی رہتی ہے۔ خمدار سڑکوں پر جو بندرگاہ سے بلندیوں کو جاتی ہیں بڑا اژدحام ہوتا ہے۔ مزدوروں کے جُبّوں یا روزمرّہ کے بیرونِ خانہ لباس میں ملبوس روسیوں کے ساتھ ساتھ آپ کو زرد چہرے ترچھی آنکھوں

والے چینی، جاپانی اور دیگر ایشیائی اپنے اپنے قومی لباس میں نظر آئیں گے۔ کیونکہ چین اور جاپان دونوں ولاڈی واسٹک کے عین دروازے پر واقع ہیں۔ آپ سوویٹ فوج کے بلند بالا، سرتاپا مسلح سپاہی اور افسر بھی دیکھیں گے، جنہیں ۱۹۴۶ء تک "سرخ فوج" کہتے تھے۔ ولاڈی واسٹک بندرگاہ اور ماہی گیری کا مرکز ہی نہیں، بڑا اہم قلعہ اور بحریے کا اڈّا بھی ہے۔ زبردست توپوں کے مورچے، جنگی طیّاروں کے زمین دوز اڈّے، کنکریٹ کے مستحکم دُھس، اور مشین گنوں کے دُمدمے سارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ زمین کی عمیق گہرائیوں میں وہ اس ہُنرمندی سے چھپائے گئے ہیں کہ ولاڈی واسٹک کی پہاڑیوں سے نشیبی علاقے پر نگاہ ڈالیں تو ہر طرف پھولوں کی کیاریاں اور جنگلات ہی نظر آتے ہیں۔ ولاڈی واسٹک بحرالکاہل کے کنارے رُوس کی بہت بڑی تجارتی بندرگاہ بھی ہے اور عظیم صنعتی مرکز بھی۔

روسی ٹی۔یو۔۱۰۴ جیٹ طیارے آپ کو ولاڈی واسٹک سے نو گھنٹے اور چند منٹ میں جو کار وغیرہ میں صرف ہوتے ہیں ماسکو پہنچا سکتا ہے۔ مگر ملک کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے ریل گاڑی بہتر رہے گی۔ سفر خاصا لمبا ہوگا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ادھر سے ادھر تک یعنی نیو یارک سے سان فرانسسکو بہ ذریعہ ریل جانے میں تین دن لگتے ہیں۔ مگر ولاڈی واسٹک سے ماسکو پہنچنے کے لیے آپ کو سوویٹ یونین سے گزرنے میں تقریباً نو دن لگیں گے۔

روسی مسافر گاڑیاں امریکی طرز کی نہیں ہیں۔ ان میں عین وسط کے بجائے گزرگاہ ایک طرف ہوتی ہے اور خواب گاہیں دوسری طرف گزرگاہ کے ایک سرے پر گاڑی کی ملازم جو بالعموم عورت ہوتی ہے رُوسی ریلوے کی نیلی وردی پہنے روٹی، مچھلی یا لحم خنزیر اور گرم گرم چائے کے گلاس پیش کرتی ہے کیونکہ رُوسی لوگ معمولاً چائے گلاسوں میں پیتے ہیں۔

ولاڈی واسٹک کا نواحی علاقہ اور بحرالکاہل کے ساتھ کا ساحلی رقبہ روسی مشرقِ بعید کہلاتا ہے ۔ اس کے اختتام پر آپ مشرق سے مغرب کی جانب سائبیریا سے گزر کر جاتے ہیں، جو بذاتِ خود ایک وسیع و عریض مُلک ہے ۔ اپنے سفر کے پہلے چار یا پانچ دن تو آپ جنگلات کے عین وسط سے گزرتے ہیں ۔ سائبیریا کے جنگلات جنہیں روسی "تائیگا" کہتے ہیں اپنی وسعت کے لیے تمام دُنیا میں مشہور ہیں ۔ کسی اور ملک میں اتنا بڑا مسلسل ، ٹھوس اور گھنے جنگلات سے ڈھکا ہُوا علاقہ نہیں ملتا ۔ ریل کی سڑک سے کوئی ڈیڑھ سو میل جنوب کی جانب "تائیگا" ختم ہوتا ہے اور وسیع گیاہ زار شروع ہو جاتے ہیں ۔ مگر شمال کی سمت جنگلات بارہ سو میل سے بھی کچھ زیادہ فاصلے تک پھیلے ہوئے ہیں اور منطقۂ منجمد شمالی تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے وہ ٹنڈرا کے اجاڑ ، وسیع ویرانوں ۱۱
اور دلدلوں سے جا ملتے ہیں جن میں بعض مقامات پر گھنی ، جنگلی جھاڑیاں ہیں اور جو سال کا بیشتر حصّہ منجمد اور برف پوش رہتے ہیں ۔

سائبیریا جنگلی اور پسماندہ ملک ہے ۔ رقبہ وسیع ہے ، مگر آبادی کم ۔ اس کی لاانتہا وسعتوں کی مجموعی آبادی ریاست نیویارک سے کچھ ہی زیادہ ہے حالانکہ رقبے کے لحاظ سے ریاست نیویارک اور سائبیریا کی مثال یہ ہے جیسے ایک مختصر سے مکان کے بمقابلہ نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ ۔ یہ سائبیریا کے مہیب جنگل ہی ہیں جنہوں نے ملک کی ترقی روک رکھی ہے کیونکہ جنگلات انسان کی نقل و حرکت میں ریگستانوں سے زیادہ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں ۔ آپ کار میں یا گھوڑے پر کسی قدر وقت سے افریقہ کے صحرائے اعظم تک سے گزر سکتے ہیں مگر ان میں سے کوئی سواری بھی آپ کو ناقابلِ گزر ، گھنے سبز جنگلوں کے اس بیابان کے پار نہیں لے جا سکتی ۔

ٹرانس سائبیرین ریلوے جس میں آپ سفر کر رہے ہیں "تائیگا" میں سے تراشی ہوئی ایک گزرگاہ سے گزرتی ہے ۔ یہ ریل کی وہ بڑی شاہراہ ہے جو پورے ملک میں

سے ولاڈی واسٹک سے مغربی سائبیریا تک جاتی ہے۔ یہاں اس کے ساتھ مزید پٹریاں
مل جاتی ہیں۔ بعض مقامات پر یہ گزرگاہ چوڑی ہو جاتی ہے۔ وہاں آپ کو کسانوں
کے دیہات میں شہتیریوں کی بنی ہوئی جھونپڑیاں اور ان کے چاروں طرف مزروعہ کھیت نظر
آئیں گے۔ جنگل کاٹ کر صاف کی ہوئی بعض جگہیں اتنی وسیع ہیں کہ ان میں بڑے بڑے شہر
آباد ہو گئے ہیں اور ان میں کوئلے کی زرخیز کانیں ہیں، کارخانے اور صنعتی مرکز قائم کیے گئے ہیں۔
مثلاً نووسی برسک کی آبادی آٹھ لاکھ نوے ہزار ہے۔ فلم، تھیٹر ہیں۔ بہت سے اسکول
ہیں، یونیورسٹی ہے اور کیا کچھ نہیں۔ ایک اور شہر خبار روسک ہے جس میں تین لاکھ
بیس ہزار باشندے آباد ہیں اور ابھی یہ اس گزرگاہ ہی کے عریض حصے ہیں جو "تائیگا"
میں سے تراشی گئی ہے۔ جونہی آپ کی ریل کسی شہر سے باہر نکلتی ہے، یہ عظیم جنگل
پٹری کے دونوں طرف یوں چھا جاتا ہے گویا آپ کے ساتھ مقابلے پر آ رہا ہے اور پھر
میلوں تک دونوں جانب سوائے درختوں کے تنوں کی مسلسل باڑ کے اور کچھ دکھائی نہیں
دیتا۔ تھوڑی بہت آبادی جو سائبیریا میں ہے وہ ان دیہات اور قریوں میں ہے جو ریل
کی سڑک کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ کچھ لوگ ان دریاؤں کے کناروں پر بھی آباد ہو گئے ۱۲
ہیں جو "تائیگا" سے گزر کر شمال کو بہتے ہیں اور بحر منجمد شمالی میں جا گرتے ہیں۔ مغرب
کی طرف جاتے ہوئے آپ ان دریاؤں کو پار کرتے ہیں۔ بعض دریا مثلاً "یینسی"، اوب،
ارتش بہت لانبے ہیں چوڑائی بھی ڈیڑھ سے اڑھائی میل تک ہے۔ ریل کی سڑک والی
گلی کو قطع کرتے ہوئے یہ دریا شمالاً جنوباً قدرتی گزرگاہیں بناتے ہیں جن میں جہازوں
کے ذریعے نقل و حرکت ممکن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جاڑوں میں سائبیریا کے دریا چند
ماہ کے لیے جم جاتے ہیں۔ مگر گرمیوں کا موسم جس میں یہ جہازرانی کے لیے کھلے ہوتے
ہیں، اس کام کے لیے کافی ہے کہ ماہی گیروں، پھندے والوں اور سونے کے کان کنوں
کی بستیوں کو جو شمال میں دور دراز فاصلے پر واقع ہیں طویل سردیوں کے لیے گیسولین،

اوزار اور اشیائے خوردنی کی مطلوبہ مقدار ان دریاؤں کے ذریعے بہم پہنچائی جائے ۔

لیکن اگر آپ ریل سے اتر کر لوگوں سے بات چیت کریں تو وہ یہ بتائیں گے کہ ریل کی سڑک اور ان دریاؤں کے مابین واقع وسیع خطوں میں کوئی آبادی نہیں بلکہ پُر اسرار، بھیانک اور ناقابلِ عبور جنگل پھیلا ہوا ہے ۔ اچھی سڑکوں کا تو کیا ذکر، البتہ پھندیت شکاریوں کی چند پگڈنڈیاں کہیں کہیں ہیں جو اس جنگل کے حاشیے کو کاٹتی ہیں ۔ باقی علاقے میں انسان کا قدم کبھی نہیں آیا ۔

صدیوں پرانے صنوبر، چیل، دیودار، شاہ بلوط اور دوسرے درخت جو بالعموم آٹھ منزلہ عمارت کے برابر اُونچے ہیں اور جن میں سے بعض کے تنے اتنے موٹے ہیں کہ آدمی کے بازوؤں میں نہیں آسکتے، ہزاروں مربع میل کی وسعتوں پر چھائے ہوئے ہیں ۔ جہاں کہیں صنوبر کی افراط ہے وہاں جھاڑیاں نہیں اُگتیں اور زمین پر سوکھی ہوئی تیلیوں کا فرش بچھا رہتا ہے۔ اس دھندلکے میں جہاں دُھوپ کا کبھی گزر نہیں ہوتا صرف سُرخی مائل خاکستری رنگ کے تنے دکھائی دیتے ہیں فقط ان درختوں کی چوٹیاں ان شاخوں اور تیلیوں کی وجہ سے سبز نظر آتی ہیں جو دُھوپ کو روک رکھتے ہیں ۔ لیکن دیودار اور شاہ بلوط کے جنگلوں میں زیرِ درختی اتنی گنجان ہے کہ انسان اس میں سے نہیں گزر سکتا ۔ جنگلات کا کچھ حصّہ ہزاروں مربع میل ناقابلِ
۱۳ گزر اور پُرفریب دلدلوں پر مشتمل ہے ۔ پُرفریب ۔ اس لیے کہ انسان کو اپنے پاؤں تلے سبز کائی
کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔ لیکن جونہی وہ اس پر قدم رکھتا ہے تو گردن تک ٹھنڈی کیچڑ میں دھنس جاتا ہے ۔ اس وقت اگر کوئی رفیق مدد کے لیے پاس نہ ہو تو دلدل اُسے نگل لیتی ہے "تائیگا" کے ایسے ہی حصّوں میں بے شمار موذی ڈانسوں اور مچھروں کے جُھنڈ اُڑتے پھرتے ہیں اور انسان پر اس تُندی سے حملہ آور ہوتے ہیں کہ اسے دیوانہ بنا دیتے ہیں ۔ پھندیت شکاری بھی جو عموماً ہر قسم کی سختیاں جھیلنے کے عادی ہوتے ہیں اس علاقے میں اپنے چہرے اور ہاتھ جالیوں سے ڈھانکے بغیر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتے ۔

دوسرے مقامات پر "تائیگا"، جنگل ایسی پہاڑیوں اور کوہستانی سلسلوں پر واقع ہیں جن میں قدرت نے کوئلے، خام لوہے، دیگر خام دھاتیں، سونے، چاندی اور پلاٹینم کے ذخیرے چھپا رکھے ہیں۔ سائبیریا ایسے ذخیروں سے مالا مال ہے مگر فی الحال بعض حصّوں کی ترقی مسدود ہے اور بعض ایسے مخفی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی معلومات نہیں اس لیے کہ جنگل نے انسان کا داخلہ روک رکھا ہے۔ آندھی اور جھکّڑ کے دنوں میں "تائیگا" موّاج سمندر کی موجوں کی طرح سائیں سائیں کرتا ہے گویا یہ درختوں کا بے پایاں، متلاطم سمندر ہے۔

پُرانے زمانے میں "تائیگا" کے دامن میں ڈاکو چھپے رہتے تھے اور بھاری اسلحے سے مسلّح قافلوں پر بھی حملہ کر دیتے تھے۔ اگر اکّا دکّا مجرم بچ کر جنگل کے ناقابلِ گزر حصّوں کی طرف بھاگ نکلتے تو وہاں سے کبھی واپس نہ آ سکتے تھے۔ بہت سے دلدلوں میں پھنس کر مرجاتے یا جنگلی درندے پھاڑ کھاتے یا پھر سائبیریا کی سردیوں میں برف کی طرح جم کر مر جاتے۔ کوئی شخص اکیلا اس سبز ویرانے میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ صرف اجتماعی کوششوں سے ہی انسان کبھی اس پر غلبہ پا سکیں گے۔

مگر "تائیگا"، سائبیریا کے تجربہ کار شکاریوں کے لیے جنّت ہے کیونکہ وہ اس کی ہر پگڈنڈی سے واقف ہیں۔ یہ ریچھوں، جنگلی لومڑیوں اور بلّیوں، بھیڑیوں، بارہ سنگوں، جنگلی سؤروں، سُرخ و سفید لومڑیوں اور ہر قسم کے پرندوں سے جنہوں نے کبھی انسان کا منہ نہیں دیکھا، پٹا پڑا ہے۔ سانپ کی طرح لچک دار اور بلّی کی طرح تیز طرّار رُوسی نیولا بھی یہاں ملتا ہے۔ اس چھوٹے سے جانور کی خوبصورت سیاہی مائل بادامی سمور بڑی نادر
اور قیمتی چیز ہے۔ بعید ترین مشرق میں ولاڈی واسٹک کا نواحی علاقہ شیروں سے بھرپُور ۱۴
ہے۔ اس لیے سائبیریا کے اکثر لوگ شکار کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ طویل سرمائی مہموں کے بعد تائیگا سے لائی ہوئی سمور تمام دنیا میں بکتی ہے۔ آپ بہت سی خواتین کو یہ سمور پہنے نیویارک کے پانچویں ایونیو یا شکاگو کی شاہراہوں پر دیکھیں گے۔

پُرانے زمانے میں سائبیریا کے کسان موسمِ بہار میں اپنی چراگاہوں کو آگ لگا دیتے تھے ۔ اس لیے کہ پار سال کی پرانی گھاس کو جلا دینے سے ان کے ریوڑوں کے لیے نئی گھاس کی بہتر فصل اُگتی تھی ۔ مگر یہ عمل خطرے سے خالی نہ تھا ۔ کیونکہ اکثر اس سوکھی گھاس کے جلنے سے جنگلوں میں آگ لگ جاتی تھی ۔ ۱۹۱۵ء میں جن خطرناک شعلوں نے بھڑک کر ہرطرف ہیبت ناک آگ لگادی تھی وہ اسی عمل کا نتیجہ تھے ۔ یہ ریل کی سڑک کے قریب مرکزی سائبیریا میں شروع ہوئی ۔ ہر ممکن کوشش کی گئی اور آخر کار سڑک کے قریب کی آگ پر قابو پالیا گیا ۔ مگر سڑک کے شمالی جانب یہ سُرعت سے پھیلتی گئی چونکہ اس عظیم جنگل میں کہیں انسان تھے نہیں جو آگ کو دبانے کا کام کرتے اس لیے بڑی تیزی سے شعلوں نے اتنے وسیع رقبے کو خاک سیاہ کر دیا جو وسعت میں فرانس، جرمنی اور پولینڈ کے مجموعی رقبے کے برابر تھا ۔

طیّارے میں بیٹھ کر اُوپر سے دیکھنے میں سینکڑوں میل تک آگ کے گرجتے ہوئے طوفان کے سوا کچھ نہ تھا ۔ مرکزی سائبیریا کی فضا پر دھوئیں کا ایسا دبیز سائبان تنا تھا کہ ٹرانس سائبیرین ریل کی سڑک پر آمدورفت کئی کئی روز کے لیے معطّل کر دی گئی ۔ شمال میں دھوئیں کا سائبان بحرِ منجمد تک پہنچ گیا ۔ قطار اندر قطار پرند سانس گھُٹ جانے سے زمین پر مردہ ہو کر گر پڑے اور بعد میں ان گنت کروڑوں جانور زندہ بھُنے ہوئے پائے گئے ۔ کئی اور غیر معمولی مناظر بھی دیکھنے میں آئے ۔ سانپوں، گلہریوں، لومڑیوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کے لشکر کے لشکر آگ سے بھاگ کر بڑے دریاؤں میں تیرنے لگے اور ان کی تپش سے پانی اُبلتا ہوا معلوم ہونے لگا ۔ جنگل کے دوسرے باسی ریچھ، بھیڑیے وغیرہ ایسے دیہات میں جنہیں کسانوں نے آگ سے بچالیا تھا جوق در جوق آپہنچے اور انسان پر اپنی بے اعتمادی کو بھلا کر اس کے پاس پناہ ڈھونڈنے لگے ۔ آخر موسم خزاں کی بارشوں نے اس ناگہانی آفت کو ختم کیا ۔

15 دنیا نے اس سے پہلے یا بعد ایسی مہیب آگ نہیں دیکھی ۔ سائبیریا میں قدرت ہر کام بڑے پیمانے پر ہی کرتی ہے ۔ سائبیریا میں رہنے والے روسی زیادہ تر بلند قامت بھورے بالوں والے اور قوی الجثہ ہیں ۔ بنیاد کاری کی سختیاں جھیلنے اور دشوار زندگی کے عادی ہونے کی بدولت وہ سخت کوش ، بہادر اور مہم پسند لوگ ہیں ۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں سائبیریا کے دستے روسی فوج کا بہترین حصّہ تھے ۔ سائبیریا کے ماضی وحال دونوں نے اس کے باشندوں کی عادات پر مخصوص اثر ڈالا ہے ۔ سائبیریا کی اکثریت خود بنیاد کاری کرتی رہی ہے یا بنیاد کاروں کی اولاد ہے عین اسی طرح جیسے امریکہ کے اوّلین آباد کار وہاں کے بنیاد کار تھے ۔ سائبیریا کے شہری لوگ اچھی آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ان کے پاس برقی روشنی ہے ، گیس ، بسیں ، اخبارات اور تھیٹر ہیں ۔ لیکن شہروں سے کچھ میل پرے بنیادکاری اب بھی جاری ہے ۔ نئی زمین کے ایک ایک ایکڑ کو قابلِ کاشت بنانے کے لیے کسانوں کو پہلے جنگل صاف کرنا ہوتا ہے اور اپنے بچھڑے اور سور بھوکے بھیڑیوں سے بچانے کے لیے سائبیریا کے تکلیف دہ کہرے میں بندوق اٹھائے پوری پوری راتیں جاگنا پڑتا ہے ۔ قیام کے لیے بارکوں کی تعمیر سے پہلے نئی کانیں کھودنے والے مزدوروں کو کئی کئی راتیں موسلا دھار بارش اور برف باری میں کھلے آسمان کے نیچے بسر کرنا ہوتی ہیں ۔

سائبیریا کا بہت سا حصّہ روسی زاروں (بادشاہوں) نے ساڑھے تین سو سال قبل فتح کر لیا تھا ۔ بعض جنگجو ، ایشیائی اقوام مثلاً منگول ، بُریات اور سیموئیُو جو پہلے سائبیریا کے دریاؤں کے کنارے آباد ہو چکے تھے وہ اس وقت بھی روسیوں کے ساتھ مل جل کر وہیں رہتے ہیں ۔ مگر اب وہ امن پسند بن گئے ہیں اور مہذب بھی ہو رہے ہیں ۔ ماضی میں جب یہاں کسی قسم کی انجن گاڑیاں ، موٹر کاریں اور کھدائی کی مشینیں نہ تھیں ، اِس وسیع سرزمین کی ترقی کے لیے ابتدائی قدم اٹھانا بھی ناممکن تھا ۔ سائبیریا کی آبادی بڑھانے

کے لیے زاروں نے مجرموں اور سیاسی قانون شکنوں کو جلا وطن کرکے یہاں بھیج دیا۔ بعض ایسے کسان بھی جن کے لیے یورپی رُوس میں کافی زمین نہ تھی سائبیریا میں بسا دیے گئے اور انھیں وہاں ہر قسم کی رعایتیں دی گئیں۔ مگر پھر بھی چنداں کامیابی نہ ہوئی اور سائبیریا بیابان ہی رہا۔ کوئی ساٹھ سال ہوئے زاروں کی حکومت نے ٹرانس سائبیرین ریلوے کی سڑک بنائی۔ اس وقت سے ملک کی ترقی شروع ہوئی گو آغاز میں اس کی رفتار بہت سُست تھی۔ ۱۹

مگر اب سوویٹ حکومت نے سائبیریا کے وسیع قدرتی ذخیروں کو ہر قیمت پر بڑی عجلت کے ساتھ ترقی دینے کی ٹھانی ہے۔ بیسویں صدی کے عشرۂ ثانیہ سے وہ بڑی مقدار میں صنعتی سامان، مشینیں اور مزدور بھیجتی رہی ہے۔ لیکن مزدوروں کی مطلوبہ تعداد حاصل کرنے کے لیے سوویٹ حکومت نے جبر و استبداد سے بھی کام لیا ہے۔ اس نے زاروں کے زمانے سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں سیاسی اور دوسرے مجرموں کو سائبیریا میں نہ صرف جلا وطن کیا ہے بلکہ انھیں بامشقت قیدیوں کی حیثیت سے بعض اوقات انتہائی تکلیف دہ حالات میں کام پر مجبور کیا ہے۔ انھیں کم خوراک دی گئی اور بہت کام لیا گیا انھیں مچھروں نے کھا لیا۔ ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا۔ یوں سائبیریا میں نئی کانیں کھودی گئیں۔ ریل کی سڑکیں اور صنعتی کارخانے بنائے گئے۔

کھُدائی کی مشینیں اپنی تیز مسلسل حرکت سے گڑگڑاہٹ پیدا کر رہی ہیں۔ نئی سڑکیں "تائیگا" جنگلات کے اندر دور تک جا پہنچی ہیں۔ لکڑی چیرنے کے بڑے کارخانے ملک کے مختلف حصّوں میں قائم کیے گئے ہیں تاکہ انسان "تائیگا" کو مغلوب کرکے اس سے عمارتی لکڑی حاصل کر سکے۔ نووسی برسک کے جنوب میں کُز نیٹسک کے طاس کے علاقے سے اعلیٰ قسم کا کوئلہ بہت بڑی مقدار میں کانوں سے نکالا جا رہا ہے اور وہاں فولاد، مشین سازی اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم ہوگئے ہیں۔ بہت تھوڑے سے عرصے

میں یہ طاس سوویٹ یونین کا اہم فلزاتی صنعتی علاقہ بن گیا ہے ۔ ٹرانس سائبیرین ریلوے کی شاہراہ سے دور شمال میں نئے ترقیاتی منصوبے مثلاً ہیرے کی کانیں ، ایک بہت بڑا برقابی توانائی کا کارخانہ اور دریائی کشتیوں کی گودیاں معرضِ وجود میں آ رہے ہیں ۔

یہ سائبیریا ہی ہے جس کے متعلق یقین کیا جا رہا ہے کہ اس میں سوویٹ کے عظیم ترین ایٹمی توانائی کے کارخانے قائم کیے گئے ہیں اگرچہ ان کا صحیح محل وقوع فوجی راز ہے اور کسی کو معلوم نہیں ۔ بعض کارخانے تو مرکزوں تک جانے والی سڑکوں کی تعمیر سے بھی پہلے کام کرنے لگے ۔ ان کے لیے مشینیں اور دیگر سامان طیاروں کے ذریعے پہنچایا گیا ۔ ان میں سے بعض علاقوں میں باوجود ترقیاتی منصوبوں کے زندگی کا طرز اب بھی بے ہنگم سا ہے اور زندگی کی اوّلین آسائشیں بھی مہیّا نہیں ۔ لیکن قابلِ اعتماد گواہوں کا بیان ہے کہ باوجود سخت تکالیف اور مصائب کے لوگ پُر اُمید ہیں اور یاس کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے ۔ ۱۷
تمام پیش رووں کی طرح سائبیریا کے بنیادکار بھی اس یقینِ محکم کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں کہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کے لیے روشن مستقبل تیار کر رہے ہیں ۔

سائبیریا کے شہروں میں ایک حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی ہے ۔ نو واردوں کے ازدحام اور نئے آثارِ حیات کی گہما گہمی کی بدولت ان میں قابلِ قدر توسیع ہی واقع نہیں ہوئی بلکہ حیاتِ تازہ بھی نمودار ہو گئی ہے ۔ پچاس سال پہلے ان میں سے اکثر شہر چھوٹی چھوٹی چوبی کوٹھریوں والے غلیظ گاؤں تھے ۔ مثلاً ولاڈی واسٹک جہاں آپ اُترے ہیں اس وقت صرف پینتیس ہزار افراد کا شہر تھا اور اس میں چند ایک ہی پکّی سڑکیں تھیں ۔ روشنی اتنی مدھم ہوتی تھی کہ رات کو شہر کی دور افتادہ سڑکوں پر شیر حملہ آوار ہو کر سُور اور گائیں اُٹھا لے جاتے تھے ۔ شہر کے عین اندر گلیوں اور گرد و نواح میں کوئلہ کھودا جا سکتا تھا ۔ مگر کانیں کھودنے کے لیے نہ سامان تھا نہ کارکن ۔ اس لیے ہزاروں میل کے فاصلے پر یورپی روس سے کوئلہ بہ ذریعہ ریل لایا جاتا تھا اور بڑا مہنگا پڑتا تھا ۔ اب ولاڈی

واشنک ایک جدید شہر ہے جس میں تین لاکھ باشندے آباد ہیں ۔ اس میں کئی ایک صنعتی کارخانے ہیں اور اس کے پاس بہت سی بارونق کوئلہ کی کانیں ہیں جہاں مستعدی سے کام ہو رہا ہے۔ سائبیریا میں کئی بالکل نئے شہر وجود میں آگئے ہیں ان میں سے ایک سٹالنسک ہے جو مذکورۂ بالا دریائے کزنیٹسک کے طاس کا بڑا مرکز ہے ۔آج اس شہر کی آبادی تین لاکھ ستّر ہزار ہے لیکن تیس سال پہلے اس کا وجود نہ تھا ۔ اس کے بجائے یہاں ایک ویرانہ تھا۔ علاوہ بریں اس کے نواح میں کئی خاصے بڑے نئے شہر آباد ہیں ۔ سائبیریا کی اہم ضرورت مزید ایسی سڑکیں اور ریل کی شاہراہیں ہیں جو ”تائیگا“ کو کاٹتی ہوئی گزریں بلاشبہ اس کے عظیم دریا اوب، ینیسی، لینا جن میں سے بعض کئی میل چوڑے ہیں مواصلات میں خاصے معاون ہیں لیکن وہ سال میں صرف پانچ چھ ماہ ہی جہازرانی کے قابل ہوتے ہیں۔ باقی وقت میں یخ بستہ رہتے ہیں ۔ سوویٹ حکومت مواصلات کی نئی راہیں تعمیر کرتی رہتی ہے ٹرانس سائبیرین ریلوے لائن سے نئی شاخیں جمہوریہ منگولیا اور دوسرے صنعتی علاقوں کو
نکالی گئی ہیں مگر ایک نئے ملک میں جس کے فاصلے اتنے وسیع ہوں سڑکوں کی تعمیر کا کام ۱۸
تیز رفتاری سے نہیں ہو سکتا اور بڑے خرچ کا طالب ہے ۔ مزید برآں ٹرانس سائبیرین ریلوے کے شمال والے وسیع دلدلی علاقوں میں جہاں تمام سال مٹی کی زیریں تہیں منجمد رہتی ہیں سڑکوں کی تعمیر میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں ۔ پھر بھی ان مشکلات پر قابو پایا جا رہا ہے ۔آپ کو معلوم ہے کہ فضائیہ ہر وقت موجود ہے اور اس سے بہت مدد مل سکتی ہے ۔ مثلاً یاکوتسک کو لیجئے جو ایک لاکھ آبادی کا شہر ہے ۔ یہاں برقی روشنی، تھیٹر، اور یونیورسٹی موجود ہیں ۔ یہ سونے کی کانوں کے اہم مرکز میں واقع ہے ۔سات سرمائی مہینوں کے دوران میں جب درجۂ حرارت اکثر صفر سے پچھتّر درجے نیچے چلا جاتا ہے، بیرونی دنیا سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے اس کا انحصار فقط طیاروں پر ہوتا ہے
روسی سائبیریا کو ”مستقبل کا امریکہ“ کہا جاتا ہے ۔ اس میں بڑی مناسبت ہے

کیونکہ ایک وقت تھا جب امریکہ بھی سائبیریا کی طرح اجاڑ بیابان تھا اور بڑی مشقت، عرق ریزی اور مدّتِ مدید کے ہاتھوں موجودہ وضع کا شاداب، زرخیز اور بارونق ملک بنایا گیا ہے۔ سائبیریا کی ترقی کا تو ابھی آغاز ہی ہوا ہے مگر خام مال کے وہ ذخیرے جن سے سائبیریا مالا مال ہے پورا روس ان کا حاجت مند ہے اور اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اس کی ترقی کا کام جاری رہے گا۔

مگر آپ کی گاڑی رواں دواں ہے۔ جونہی یہ نوووسی برسک سے نکلتی ہے علاقے کی فضا بدل جاتی ہے۔ اب جنگل میں مزید کشادہ مقامات نظر آتے ہیں۔ پھر آپ غیر متناہی کھلے میدانوں کی فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جو "پریریز" یعنی گیاہ زار ہیں۔ یہ میدان ایسی گھاس سے ڈھک جاتے ہیں جو قد آدم اُونچی ہو جاتی ہے اور موسم بہار میں پھولوں سے لد جاتی ہے۔ ان "پریری" میدانوں میں جنہیں روسی اسٹیپز یعنی گیاہستان کہتے ہیں، گیہوں، رائی اور آلو کے وسیع کھیت نظر آتے ہیں۔ روسی خواتین سفید نیلے اور سرخ رومال سروں پر باندھے ٹریکٹر یا گھوڑے جتے ہوئے ہل چلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ اب آپ مغربی سائبیریا میں ہیں۔ یہاں زمین بڑی زرخیز ہے اور اناج کی فصلیں سال بہ سال بڑھتی جاتی ہیں۔ ملک کا یہ حصّہ جنگلی علاقے کی نسبت جہاں سے آپ گزر آئے ہیں بہت زیادہ تہذیب یافتہ اور گنجان آباد ہے۔

اب آپ کوہستان یورال کے قرب میں ہیں۔ یہ پہاڑیوں اور پہاڑوں کے متعدد سلسلے
ہیں جو شمالاً جنوباً پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے بعض حصوں پر گھنے جنگل اور جھاڑیاں ہیں۔ کئی ایک ۱۹
ہری گھاس سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہ پہاڑ سوویٹ یونین کے متمول ترین صنعتی حصّے ہیں روس کی بڑی بڑی کوٹھے، خام لوہے، تانبے اور المونیم کی کانیں، کلدار بھٹیاں اور کھلے آتشدان اسی حصّے میں ہیں۔ یہاں زندگی میں حرارت اور گرم جوشی ہے۔

جونہی آپ کی گاڑی چیلیابنسک کے اسٹیشن پر جو یورال کا بڑا صنعتی شہر ہے، پہنچتی

ہے آپ کو لاتعداد چھوٹی پٹڑیوں پر کوئلے، مشینوں اور دوسرے سامان سے بھری ہوئی کھلی چھتوں والی گاڑیاں نظر آئیں گی۔ کارخانوں کی اونچی چمنیوں سے دھوئیں کے مرغولہ دار بادل نکل رہے ہوں گے اور آپ کو ایسا معلوم ہوگا گویا آپ پٹسبرگ آگئے ہیں۔ دیگر کاروبار کے علاوہ چیلیا بنسک کو عظیم الشان اور ٹریکٹروں کے بالکل جدید کارخانے کا بھی فخر حاصل ہے۔ روس کا بہت سا بارود اور اسلحہ اور بعض جنگی طیارے آج کل یورال کے مختلف شہروں ہی سے آتے ہیں اور جنوبی یورال کا حالیہ تعمیر کردہ
شہر میگنیٹو گورسک ایسا فلزاتی مرکز ہے کہ اسٹالنسک سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ 19

ابھی تک آپ روس کے ایشیائی حصے میں تھے کیونکہ سائبیریا ایشیا میں واقع ہے۔ لیکن کوہستان یورال ایشیا کو یورپ سے جدا کرتا ہے۔ ان سب سے گزر کر آپ سوویٹ یونین کے یورپی حصے میں آجاتے ہیں یعنی وہی حصہ جس کا تصور روس اور روسی تاریخ کے متعلق سوچتے وقت اکثر امریکی اپنے ذہنوں میں باندھتے ہیں۔

اب آپ کی ریل تیزی کے ساتھ کسانوں کے شاداب دیہات کے گیہوں، رائی اور جئی کے لامتناہی کھیتوں کے پاس سے گزرتی ہے۔ ادھر ادھر آپ کو گھوڑوں پر سوار، نوعمر گڈریے مویشیوں کے بڑے بڑے گلّوں کی پاسبانی کرتے نظر آئیں گے۔ تمام منظر ریاستہائے متحدہ کے وسطی مغربی سپاٹ، ہموار، اناج پیدا کرنے والے علاقوں سے مشابہ معلوم ہوتا ہے اور جتنا آپ مغرب کو جائیں اتنا ہی زیادہ آپ کی ریل ایسے سٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے اور ایسے شہروں سے گزرتی ہے جن کے مکانوں کی چھتیں، کارخانوں کی عمارات اور گرجوں کے گنبد آفتابِ عالمتاب کی روشنی میں چمک رہے ہوں گے۔ ایسے ہی ایک شہر کوئبی شیو میں آپ روس کے مشہور ترین دریائے والگا کے قریب پہنچیں گے۔
روسی شعراء نے اس دریا کے متعلق جسے وہ "والگا مائی" کہتے ہیں بے انتہا خوبصورت ۲۰
نظمیں لکھی ہیں۔ ہم میں سے کس نے "والگا ملاحوں کا گیت" نہ سنا ہوگا؟

جونہی آپ کوبئی بیشو کے سٹیشن پر اتریں گے آپ کو پرُسکون ایک میل سے زیادہ چوڑی ندی نظر آئے گی ۔ اس میں بنی ہوئی گودیوں اور ان کی طرف جانے والی ریل کی چھوٹی چھوٹی پٹڑیاں اور ساحل کے اس پار خوبصورت مکانات اور تفریح گاہیں دکھائی دیں گی ۔ والگا بڑا دریا ہے مگر کئی ایک دوسرے دریاؤں سے جنہیں آپ نے سائبیریا میں پار کیا ہے یا مسیسپی اور میسوری دریاؤں کے مجموعے سے بڑا نہیں ۔ مگر والگا تمام رُوسی دریاؤں سے زیادہ اہم ہے ۔

آپ اس کی اہمیت کا اندازہ تب لگا سکیں گے جب آپ کوبئی بیشو کی گودیوں کے سامنے جہازوں کی تعداد کھڑی دیکھیں گے ۔ ان میں بڑے بڑے آرام دہ مسافر جہاز ہیں جن کے ذریعے رُوسی بچّے ، عمّال ، سرکاری حکّام اور دوسرے شہری تعطیلات کے تفریحی سفر کرتے ہیں کیونکہ دریا بہت طویل ہے اور آپ ایک ہی طرف دس بارہ دن تک ان میں بیٹھ کر سفر کر سکتے ہیں ۔ بڑے بڑے تیل بردار جہاز ، بجرے ، مال بردار جہاز اور ماہی گیری کی کشتیاں بھی ہیں ۔ اس کے علاوہ منجدھار میں آپ لٹھوں کے بیڑوں کا طولانی سلسلہ دیکھیں گے جن پر لکڑی لدی ہوئی ہے اور عملے کے لیے اوپر یا ایک طرف چھوٹی کوٹھڑیاں ہیں کیونکہ والگا ہی پر رُوسی لوگ یورپی روس کے شمالی صوبوں سے جنوب کی طرف جہاں درخت کم ہیں لکڑی بہاتے ہیں ۔ ان کوائف سے واضح ہو گا کہ یہ بہت مصروف اور فعّال زندگی والا دریا ہے ۔ فی الواقع لاکھوں رُوسیوں کی حیات کا دار و مدار اس پر ہے کیونکہ یہ ملک کی نہایت اہم تجارتی اور مواصلاتی شاہراہ ہے ۔

والگا دو ہزار تین سو میل لمبا ہے ۔ اس کے بعض معاون مثلاً اوکا اور کاما بھی بڑے اور قابل جہاز رانی دریا ہیں ۔ یہ ماسکو کے شمال مغرب سے نکل کر یورپی رُوس میں سے ایک بے ترتیب نیم دائرہ کی شکل میں گزرتے ہوئے بحیرۂ خزر میں جا گرتا ہے ۔۔۔ جنوب کی طرف اپنے لمبے سفر پر جاتے ہوئے یہ بڑے مشہور علاقوں یعنی شمالی جنگلوں ،

ماسکو کے صنعتی رقبوں اور کوئبی بیشو کی نواحی زرخیز وسیع مزروعہ زمین اور مویشیوں کی ۲۱
پرورش گاہ سپاٹ ، گرم ، نیم صحرائی کالمِک کے علاقے سے گزرتا ہے ۔ بندرگاہ استراخان کے گردونواح میں اس مقام کے قریب جہاں والگا بحیرۂ خزر میں گرتا ہے سوویٹ یونین کے گوشت اور مچھلی محفوظ کرنے کے بہت بڑے مرکز ہیں ۔ ہاں یہیں سے رُوس کی نمکین مچھلی امریکہ جاتی ہے ۔ بحیرۂ خزر کے مغربی ساحل کے ساتھ قفقاز ہے جو من جملہ دیگر خصوصیات کے رُوس میں تیل کی پیداوار کا بہت اہم علاقہ ہے ۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ سب علاقے مختلف اشیاء کے مرکز ہیں اور والگا پر چلنے والے جہازوں کے ذریعے ان اشیاء کا مبادلہ ہوتا ہے ۔ گرم قفقاز کے کروڑوں پیپے گیسولین نیز خوش ذائقہ پھل ، استراخان کی مچھلی اور کالمِک کے علاقے کے مویشی والگا کے راستے ماسکو جاتے ہیں کیونکہ وہاں یہ چیزیں کم یاب ہیں ۔ اناج سے بھرے ہوئے جہاز کوئبی بیشو سے دریا کے راستے شمال اور جنوب کو آتے جاتے ہیں ۔ ماسکو کا رقبہ ایسی اشیاء جو اس میں افراط سے ہیں مثلاً نئے کارخانوں کے لیے صنعتی سازو سامان اور دوسری مشینیں ، کپڑا ، روزمرہ کے استعمال کی اشیاء اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں عمارتی لکڑی جنوب کو بھیجتا ہے ۔ اس طرح "والگا مائی" ہمیشہ مصروف رہتی ہے ۔ یہ ایسی تجارت کے لیے نہ صرف آسان بلکہ کم خرچ راستہ ہے کیونکہ کشتیوں کے ذریعے سامان کی نقل وحرکت ریل گاڑی اور سڑکوں کی نسبت بہت سستی پڑتی ہے ۔ کروڑوں رُوسی کسانوں کا جو کوئبی بیشو کے نواح میں رہتے ہیں والگا پر انحصار ہے ۔ موسمِ بہار آتے ہی کھیتوں میں کام شروع ہو جاتا ہے ۔ ٹریکٹر ، کمبائن اور دوسری زرعی مشینوں کو اس کام کے لیے گیسولین کی بڑی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے جو دریائے والگا کے تیل بردار جہازوں کو قفقاز سے لانا ضروری ہے ۔ مگر دریا موسمِ سرما میں تین چار ماہ تک منجمد رہتا ہے ۔ بہر حال تیل برداروں کا ایک پورا بیڑا ماہِ مارچ کے وسط تک استراخان میں جمع ہو کر

انتظار کرتا ہے ۔ جونہی والگا کی برف ٹوٹتی ہے اور پانی کے بہاؤ کا راستہ برف کے تودوں سے
صاف ہوتا ہے تو یہ منتظر بیڑا اس کی اور اس کے معاون دریاؤں کی طرف فی الفور لپکتا ہے اور
لدا ہوا قیمتی مال کسانوں کے حوالے کر دیتا ہے ۔ اس سامان کا شدت سے انتظار ہوتا ہے اور
۲۲ کیوں نہ ہو جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر موسم بہار کے کچھ موخر ہونے کی وجہ سے ٹینکر دیر
سے پہنچیں تو زمین میں ہل چلانے اور بیج ڈالنے میں بھی تاخیر واقع ہوگی اور ہر کاشت کار
جانتا ہے کہ دیر سے بیج بونے کا نتیجہ فصلوں کی کمی ہے ۔ پھر ان ٹینکروں کے منتظر کسان
ہی نہیں ہوتے بلکہ والگا کے کنارے کے سینکڑوں کارخانوں ، برقی توانائی کے پلانٹ اور
دوسرے صنعتی مرکزوں کو گیسولین کی تازہ مقدار کی اشد ضرورت ہوتی ہے ۔

رُوسیوں کے لیے والگا کی اس اہمیت کے سبب ہی ۱۹۴۲ء کے موسم گرما میں
ہٹلر کی افواج نے اسٹالن گراڈ پر زبردست دھاوا بولنے کا فیصلہ کیا ۔ کوبئی بیشو اور
استراخان کے مابین والگا کے کنارے سٹالن گراڈ بہت بڑا شہر ہے اور دریا کے
کنارے یہی ایک مقام تھا جہاں جرمن مغرب کی طرف سے پہنچ سکتے تھے ۔ جرمنوں کی
چال بڑی عیّارانہ تھی اور یہ رُوسیوں کے لیے انتہائی خطرناک اور مہلک ثابت ہو سکتی تھی ۔
حملہ آوروں نے اسٹالن گراڈ کو قبضے میں کر کے والگا کا راستہ منقطع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ۔
انھوں نے اپنے بمبار اور بھاری توپیں دریا کے مغربی کنارے پر اس لیے رکھی تھیں کہ وہ
پاس سے گزرنے والے ہر روسی جہاز اور ٹینکر کو ڈبو دیں اور اس طرح قفقاز سے آنے
والی گیسولین سوویٹ یونین کے کسی حصّے کو میسّر نہ آ سکے ۔ کوبئی بیشو کے کسان اپنے
کھیتوں کو کاشت نہ کر سکیں ، روٹی کا قحط پڑ جائے جو روسیوں کی اہم خوراک ہے ۔ اس
طرح جنگی ساز و سامان والے کارخانے بند ہو جائیں گے ۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ
گیسولین کے بغیر رُوسی فوج کے ٹینک اور ہوائی جہاز مفلوج ہو کر رہ جائیں گے ۔ والگا
پر جہاز رانی بند ہو جائے گی ۔ پھر ماسکو اور جنوبی علاقے کے مابین دوسرے تجارتی

سامان کا لین دین ختم ہو جائے گا اور انجام کار رُوس افراتفری اور قحط کا شکار بنے گا۔

یہ سب کچھ رُوس کا گلا گھونٹنے کے برابر ہوگا اور جرمنوں کے لیے اس کی فتح آسان ہوگی۔

اس منصوبے کے پیشِ نظر حملہ آوروں نے دھاوے کا آغاز کیا اور سخت جنگ و جدال
کے بعد نازی فوج نے سٹالن گراڈ کے قریب پہنچ کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ گزشتہ صدیوں
میں جب منگول اور تاتاریوں نے روس پر مشرق کی جانب سے یورشیں کیں تو "والگا مائی"
کی آنکھ نے بڑے بڑے معرکے دیکھے مگر جو ہولناک مناظر ۱۹۴۲ء میں اس کے سامنے آئے
وہ بے مثال تھے۔ رُوسیوں نے مدافعت میں دادِ شجاعت دی مگر دشمن غلبے میں کامیاب ۲۳
ہوگیا اور سٹالن گراڈ کی بعض گلیوں میں داخل ہوگیا جو بمباری اور گولہ باری سے راکھ کا ڈھیر
بن کر رہ گئی تھیں۔ مزید برآں حملہ آور شہر کے شمال میں دریائے والگا پر پہنچ گئے جہاں
ان کی توپیں پہلے سے نصب تھیں۔ یہ رُوس کے لیے انتہائی خطرناک زمانہ تھا لیکن جرمنوں
کا اندازہ غلط نکلا۔ سٹالن گراڈ کی طرف بڑھتے ہوئے ان کی جرّار فوجوں نے کثرتِ تعداد پر بھروسا
کر کے اپنے تئیں بہت زیادہ پھیلا دیا جس سے ان کے پہلو غیر محفوظ ہو گئے۔ سوویٹ
فوج کے سپہ سالاروں نے اس موقع سے فوراً فائدہ اٹھایا اور سٹالن گراڈ کے شمال
اور جنوب میں انتہائی راز داری کے ساتھ بڑی تعداد میں ٹینک، پیادہ فوج، بارود
اور اسلحہ جمع کر دیا۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں تو روسیوں نے یلغار کر کے شاندار فتح
حاصل کی۔ دشمن اس ناگہانی داؤ کا شکار ہوگیا۔ اس کی تمام فوج جو سٹالن گراڈ کا محاصرہ
کیے ہوئے تھی نرغے میں آگئی۔ جو حملہ آور سپاہی موت سے بچ گئے انھوں نے ہتھیار ڈال
دیے۔ اس چال سے اہلِ روس تباہی سے بچ گئے اور جب حملہ آوروں کی توپوں کا خدشہ
ٹل گیا تو ٹینکر، مسافر جہاز اور باربردار پھر حسبِ معمول "والگا مائی" کی پُرسکون سطح پر آمدو
رفت جاری کر کے اپنے مفید اور اہم فرائض انجام دینے لگے۔

ماضی میں جب دخانی اور موٹر جہاز نہ تھے والگا پر جہاز رانی بڑی مشکل تھی۔ کشتیوں
اور لٹھوں کا دریا کے بہاؤ پر تیرتے جانا آسان ہے اس لیے کہ لہریں خود بخود انھیں بہالے جاتی ہیں مگر
بھاری لدی ہوئی کشتیوں کا چڑھاؤ کی طرف کھینا بہت مشکل کام ہے کیونکہ چوڑے سے چوڑے
دریا کی سطح بھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ بادبان وہاں اتنے مفید نہیں ہو سکتے جتنے کہ سمندر
کی وسیع و عریض سطح پر۔ مگر موانعات کے باوجود ان دنوں بھی والگا کے راستے چڑھاؤ
کی طرف سامان لے جایا جاتا تھا۔ جوق در جوق خاص مزدور جنہیں بُرلاکی کہتے تھے۔
دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وزنی کشتیوں کو رسّے سے
باندھ کر کھینچ لے جاتے تھے۔ یہ کام یقیناً بڑا سُست رفتار اور مزدوروں کے لیے
انتہائی مشقت طلب تھا پھر بھی انسانوں کے یہ گروہ روزانہ اسی طرح چلتے اور اسی
طرح مصروفِ کار رہتے تھے یہاں تک کہ سامان دریا
سے گزر کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا تھا۔ جب یہ مزدور یعنی بُرلاکی بارش، سردی
یا چلچلاتی دھوپ میں بوجھ کھینچتے تھے تو گاتے بھی جاتے تھے۔ رُوسیوں کو ہمیشہ سے ٢٧
یہ یقین رہا ہے کہ گانے سے محنت کی شدّت کم محسوس ہوتی ہے۔ ان سادہ اور
دلنواز گیتوں میں جو انھوں نے خود بنائے اور جنھیں وہ اپنے کام کے دوران میں گاتے
تھے "والگا کے ملاحوں کا گیت" بھی تھا۔

اگر آپ کا ارادہ کوبی شیو میں رات بسر کرنے کا نہ ہو تو پھر تیّار ریل میں سوار ہونے کی جلدی کیجیے۔ یہ آپ کو ایک دن میں ماسکو پہنچا دے گی۔

اب آپ ماسکو کے صنعتی علاقے سے گزر رہے ہیں۔ ایک بڑی تعداد موٹر گاڑیوں اور ٹرکوں کی پکّی اور کچّی سڑکوں پہ جو کبھی متوازی جاتی ہیں اور کبھی ریلوے لائن کو کاٹتی ہیں بڑی تیزی سے دوڑتی نظر آئیں گی۔ صنعتی شہر اور آبادیاں آنکھ جھپکتے میں سامنے آتی اور گزر جاتی ہیں۔ ہر قسم کا صنعتی سامان کپڑے سے لے کر بجلی کے قمقموں اور

انتہائی نازک آلات تک ان مقامات پر اور بالخصوص ریل کی سڑک کے شمالی علاقے میں تیار ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں آبادی بھی گھنی ہے۔ یہ سوویٹ یونین کا وہ حصہ ہے جہاں آبادی سب سے زیادہ گنجان ہے۔

آپ کی گاڑی تیزی کے ساتھ برچ اور صنوبر کے جنگلات سے بھی گزرتی ہے۔ برچ کے باوقار جھکے ہوئے سفید تنے اور ان کے نازک پتّے حوالیِ ماسکو کے مخصوص منظر کا پتا دیتے ہیں۔

پھر آپ کی ریل گاڑی یکے بعد دیگرے ملے جلے صنعتی اور رہائشی مضافات سے گزرتی ہے۔ پٹڑیوں کے جال پر سے گزرتے وقت اس کے پہیے کھڑکھڑانے لگتے ہیں سٹیشن آنے سے پہلے غلیظ، بوسیدہ چوبی جھونپڑیاں کسی طویل کارخانے یا ذخیرہ گاہ کی عمارت کے ساتھ ملحق نظر آتی ہیں۔ کہیں سائبانوں کے نیچے چینی ظروف کے ڈھیر نظر آتے ہیں مگر اس بدنما نظارے سے دُور نگاہ اٹھا کر دیکھیے تو آپ کو بلند عمارات اور کلیساؤں کے سنہری گنبدوں کی ایک بے قاعدہ افقی قطار نظر آئے گی اور ساتھ ہی لاتعداد چھتوں کا بے ربط سلسلہ یوں دکھائی دے گا گویا وہ صبح صادق کے دھندلکے اور دھوئیں میں تیر رہا ہے اور آفتابِ عالمتاب کی کرنیں اسے پگھلا رہی ہیں۔

اس کے پندرہ منٹ بعد آپ کی گاڑی ایک بہت بڑے سٹیشن پر لوگوں کے جمّ غفیر کے درمیان ٹھہر جائے گی۔ لیجیے آپ ماسکو پہنچ گئے۔

باب ۰ ۲

ماسکو اور لینن گراڈ

رُوس کی اکثر موٹر کاریں اور ٹیکسیاں امریکی طرز کی ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان میں آرائشی نیکھ نہیں ہوتے اس ضمن میں یہ تبلا دینا بھی مناسب ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں روسی حکومت نے امریکہ کی امداد سے پہلی بار موٹر انجنوں کے بڑے کارخانے قائم کیے تھے ۔ سوویٹ موٹر کاروں کی بعض اقسام مثلاً چھوٹی سی مضبوط، گنجائش دار چار نشست کی "مسکووائٹ" خوب ہے ۔ مگر آپ کو یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگے گی کہ نیو یارک کی نسبت ماسکو کی سڑکوں پر ہجوم بہت کم ہے ۔

سٹیشن سے کسی ہوٹل جانے کے لیے آپ ٹیکسی میں سوار ہو کر ماسکو شہر سے پہلی بار گزرنا کبھی نہ بھولے گا ۔ اس بڑے روسی دارالحکومت میں آنے والے تمام غیر ملکی سیاح متفق الرائے ہیں کہ یہ دنیا کے بوقلموں اور خوبصورت ترین شہروں میں سے ہے ۔

یہاں زندگی میں بڑی گہما گہمی ہے جو عجیب سی مگر خوبصورت ہے ۔ یہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے آپ امریکہ میں عادی ہیں ۔ تنوّع اور نیرنگی ہی شاید سب سے نمایاں چیز ہے جو ماسکو پیش کرتا ہے گویا یہ ایک وسیع و عریض آراستہ پیراستہ قالین ہے یا رنگا رنگ اور مختلف اشکال کے ٹکڑوں کے بنا ہوا لحاف ہے ۔ اسے اضداد کا مجموعہ سمجھیے کیونکہ یہاں شاید ہی دو مکان یا دو سڑکیں ایک جیسی ہوں ۔

ماسکو کی بعض سڑکیں اسفالٹ (کولتار اور ریت کا مرکب) کی بنی ہوئی اور آٹھ گلیوں کے برابر چوڑی ہیں ۔ دوسری تنگ ، ٹیڑھی ، بل کھاتی سڑکیں سنگریزوں کی بنی

ہوئی ہیں وہ بہت پرانی ہیں اور ایسی ہی نظر آتی ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے لوگ اسی قسم کی گلیوں میں رہتے تھے۔ یہ گلیاں ہمارے شہروں کے برعکس کسی خاص منصوبے کے تحت نہیں بنائی گئیں۔ بعض بل کھاتی ہوئی اور چکر کاٹتی ہوئی یکایک کسی بند گلی یا بند چوک میں ختم ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جہاں راستہ بھول جانا اتنا آسان ہے مگر ماسکو کی سڑکوں کی نسبت اس کی عمارتیں اور بھی زیادہ تعجب خیز ہیں۔

جیسے جیسے آپ کی کار گزرے گی آپ کو ٹھوس شیشے، کرومیم اور سنگِ مرمر کی ۲۶
چمکتی دیواروں والی خوش وضع جدید عمارتوں کی قطاریں نظر آئیں گی۔ عام طور پر یہ زیادہ بلند نہیں۔ ایک عمارت جو ماسکو میں واقعی بلند کہنی چاہیے وہ نئی تینتیس منزلہ بڑی شان و شکوہ والی چمکدار، نظر فروز ماسکو یونیورسٹی ہے۔ ان عمارات کے ساتھ ساتھ کہیں اٹھارویں صدی کا قصر نما ستونوں والا مکان ہے جو ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے کسی متمول امیر کا محل تھا۔ کہیں باڑ کے پیچھے باغ کے بیچوں بیچ دو منزلہ چوبی مکان ہے یا کرائے کے آراستہ مکان ہیں جو ساٹھ ستّر سال پیشتر روس میں بنائے جاتے تھے۔ لیکن غالباً ماسکو کی نمایاں خصوصیت یہاں کے کلیسا ہیں۔

جگہ جگہ خلافِ توقع ہر دو جدید عمارتوں کے درمیان ٹھُسا ہوا یا علیحدہ کسی چھوٹے سے چوک کے عین وسط میں آپ کو کوئی نہ کوئی گرجا نظر آئے گا۔ یہ گرجا اکثر بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی وضع قطع اور ہیئت میں بڑا فرق ہے۔ بعض سفید، سادہ، بالکل سیدھی اور متناسب دیواروں کے ہیں۔ بعض رنگ برنگ کے بُرجوں کا مجموعہ ہیں اور زینوں اور خوش نما پیچیدہ نقش و نگار سے آراستہ یوں معلوم ہوتے ہیں گویا پتھر کی بنی ہوئی جھالر ہیں۔ امریکی گرجاؤں کے برعکس یہاں کے گرجاؤں پر سنہری پیاز نما قبّے بنے ہوئے ہیں جن کی چوٹیوں پر صلیبیں نصب ہیں۔ ماسکو کے اکثر گرجا کم از کم دو سو سال اور بعض اس سے بھی زیادہ پُرانے ہیں۔ ان دنوں روسی بڑے مذہب پرست تھے اور اب بھی

بہتیرے ایسے ہیں۔ کلیساؤں کے بُرجوں پر پیازی قُبّے لگانے سے روسیوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ ایسے نظر آئیں گویا جنابِ مسیح علیہ السّلام کے مجسّمے کے سامنے مشعل جل رہی ہے اور فی الحقیقت وہ یہ کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وسیع سایہ دار شاہراہوں اور تنگ گلیوں میں پیدل چلنے والوں اور موٹر گاڑیوں کی بڑی آمدورفت ہے۔ بسیں بھرپور ہوتی ہیں اور اڈوں پر سے بھاری تعداد میں لوگ چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ بہت سے اشخاص کاروباری لباس میں ہوتے ہیں کیونکہ ماسکو روس کا واحد عظیم صنعتی شہر ہے۔ اس کے مضافات میں دو سو سے زیادہ بہت بڑے صنعتی کارخانے
۲۷ ہیں اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم ہیں۔ ان میں سے بعض مثلاً کاریں بنانے کا، بال بیرنگ بنانے کا اور تیل صاف کرنے کا کارخانہ یورپ کے عظیم ترین اور بہترین سازو سامان والے کارخانوں میں شمار ہوتے ہیں۔

سڑکوں پر چلتے ہوئے ہجوم پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ روسی بالعموم بلند قامت، فربہ، نیلی آنکھوں والے ہیں۔ اکثر کے رخسار کی ہڈیاں چوڑی ہیں۔ دیگر اقوام کی طرح روس میں بھی بد لباس اور خوش پوش دونوں طرح کے آدمی ہیں مگر اوسطاً جو کپڑے روسی مرد اور عورتیں پہنتے ہیں وہ امریکی شہریوں کے لباس کی نفاست و پاکیزگی کو نہیں پہنچتے۔ روسی عوام کا لباس پاکیزہ نہیں: وجہ یہ ہے کہ ماضی قریب میں سوویٹ یونین بڑی غربت کا شکار تھی۔ اگرچہ کچھ عرصے سے حالات بہتر ہوگئے ہیں اور روز بروز اصلاح ہو رہی ہے پھر بھی اوسط روسی اوسط امریکی سے کم کماتا ہے۔ ایسا کیوں ہے یہ آئندہ بیان کیا جائے گا اس وقت اتنا ہی سمجھیے کہ بعض مبصّروں کے خیال میں سوویٹ یونین کا رائج الوقت اشتراکی اقتصادی نظام بڑی حد تک اس کا ذمہ دار ہے۔

روسیوں کے لیے ماسکو وہی اہمیت رکھتا ہے جو واشنگٹن اور نیو یارک مل کر امریکیوں

کے لیے ۔ یہ سوویٹ حکومت کی راج دھانی اور سوویٹ یونین کا سب سے بڑا کاروباری اور تعلیمی مرکز ہے ۔ آبادی کے لحاظ سے ماسکو نیو یارک کے برابر نہیں ۔ ماسکو کی آبادی پچاس لاکھ ہے جب کہ واشنگٹن قریباً اسّی لاکھ آبادی کا شہر ہے مگر روسی راج دھانی کا رقبہ نیو یارک سے کہیں زیادہ ہے ۔

سوویٹ یونین کا مخصوص مرکز اور دارالخلافہ ہونے کے علاوہ ماسکو روس کی ریلوں کا مرکز بھی کہلاتا ہے ۔ فی الواقع اگر آپ سوویٹ یونین کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ درجن سے زیادہ ریلوے شاہراہوں کی قطاریں اور سڑکیں ماسکو سے ہی نکل کر ہر طرف جاتی ہیں ۔ سوویٹ یونین کے یورپی حصّے میں آپ کسی سمت سفر کریں شمال ہو یا جنوب ، مشرق ہو یا مغرب آپ کو قریباً ہمیشہ ہی ماسکو سے ہی گزرنا ہوگا ۔ اس صورتِ حال نے ماسکو کو یورپ کا عظیم ترین ریلوے مرکز بنا دیا ہے ۔ روزانہ دو لاکھ ساٹھ ہزار افراد سفر کر کے اس میں آتے اور جاتے ہیں ۔ ٢٨

اس نقشے پر مزید غور کرنے سے ایک اور اہم نکتہ واضح ہوگا ۔ آپ دیکھیں گے کہ یورپی روس کے اکثر بڑے دریا ماسکو کے نواحی رقبے سے نکلتے ہیں اور ریل کی سڑکوں کی طرح اسی مرکز سے چاروں طرف بہتے ہیں ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ والگا کا منبع اس بڑے شہر کے قریب ولڈائی پہاڑیوں میں ہے ۔ خود ماسکو دریائے مسکووا کے کنارے ہے جو دریائے اوکا کے ذریعے والگا سے مل جاتا ہے ۔ دوسرے دو بڑے دریا ڈنیپر اور ڈان کا منبع بھی ماسکو کا علاقہ ہے اور یہیں سے وہ جنوب کی طرف بہتے ہیں ۔ اوّل الذکر بحیرۂ اسود میں جا گرتا ہے اور آخر الذکر بحیرۂ ایزوف میں اور پھر دریائے ڈوینا کے (جو شمال میں بحیرۂ ابیض میں مل جاتا ہے) معاون دریاؤں کے منبع بھی سوویٹ دارالحکومت کے آس پاس ہی ہیں ماسکو کا وجود میں آنا اور موجودہ ارتقاء انہی کوائف کا مرہونِ منت ہے ۔

ماسکو آٹھ سو سال سے زیادہ پرانا ہے تاریخی دستاویزیں شاہد ہیں کہ یہ ۱۱۴۷ء

میں موجود تھا ۔ مگر اس وقت یہ جنگلات میں پوشیدہ چھوٹے چھوٹے دیہات کا مجموعہ تھا جسے کچکوو کہتے تھے ۔ آج کی طرح اس زمانے میں روسیوں کی مرکزی حکومت نہ تھی ۔ روس متعدد علاقوں میں بٹا ہوا ایک چھوٹا سا ملک تھا اور ہر علاقے میں وہاں کا سردار حکمراں تھا ۔ یہ سردار اکثر اوقات مل کر دشمن کے مقابلے میں متحدہ محاذ بنا لیتے تھے ۔ مگر بعض موقعوں پر ایک دوسرے کے علاقے پر قبضہ جمانے کی غرض سے آپس میں بھی لڑنے لگتے تھے ۔

۱۱۴۷ء کے لگ بھگ کچکوو کے دیہات اس رقبے کا جزو بن گئے جو شہزادہ یوری ڈولگوروکی کی جاگیر تھا ۔ یہ شہزادہ بڑا سخت گیر مگر طاقت ور، زیرک اور دور بین تھا ۔ اس کی راج دھانی ماسکو کے شمال مشرق میں ایک چھوٹا سا شہر سُزڈال تھی مگر وہ مختلف اوقات میں کچکوو آیا اور اسے بہت پسند کیا ۔ دریائے مسکووا کے عین
۲۹ ساحل پر اس کا محلِ وقوع اس کے لیے خاص کشش کا باعث ہوا ۔ مزید یہ کہ بہت سے اور دریا بھی اسی کے گرد و نواح سے نکلتے تھے ۔

روسیوں کی زندگی میں دریائے والگا آج بھی بڑا کردار ادا کر رہا ہے ۔ سائبیریا کے دوسرے بڑے دریاؤں کی بھی یہی کیفیت ہے ۔ مگر شہزادہ یوری کے زمانے میں جب انسان ریلوں اور پکی سڑکوں کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا صرف دریا ہی تجارت کے لیے آسان شاہراہ تھے ۔ شہزادہ یوری نے اپنی دقیقہ رسی اور دور اندیشی کی بدولت کچکوو کے محلِ وقوع کی افادیت کو بھانپ لیا ۔ اس نے دریائے مسکووا کے کنارے ایک مضبوط قلعہ بنوایا اور اس کے اندر اپنا محل اور گرجا تعمیر کرایا ۔ کچھ گرجا قریب ہی مگر قلعے کے باہر بنائے گئے ۔ یہ تمام عمارتیں اور قلعہ کی تکون فصیل سب لکڑی کی تھیں بہت جلد دریائے مسکووا کی نسبت سے اس شہر نے بھی ماسکو نام پایا ۔

برسوں بیت گئے اور وقت نے یوری کے حسنِ انتخاب کی داد دی ۔ اس کے پوتوں اور پڑپوتوں کی زیرِ قیادت ماسکو بڑی سرعت سے پھولتا پھلتا رہا آبادی کی کثرت

سے قلعے کے اندر گنجائش باقی نہ رہی تو چوبی عمارتوں کا پورا شہر باہر کی جانب بس گیا اور قلعہ کے گرد چاروں طرف روز افزوں تعمیرات کا سلسلہ چل پڑا۔ اب اس نوخیز شہر میں زندگی کے شور و شغب اور اژدہام کے کاروباری تقاضے تھے اور یہاں نہ صرف روس کی بلکہ تمام مشرقی یورپ کی بڑی بھاری تجارتی منڈی بن گئی۔

چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے دریاؤں کو پار کر کے روسی بحیرۂ خزر کے راستے نہ صرف ایران اور ہندوستان گئے بلکہ بحیرۂ بالٹک کے کنارے واقع جرمنی کے متمول تجارتی شہروں میں بھی جا پہنچے۔ وہ غیر ممالک کو روسی سمور، چمڑا، موم، شہد اور ماسکو کے جنگلات کی دوسری پیداوار بیچتے تھے اسی طرح عرب، ایرانی، چینی، یونانی لاطینی اور جرمن تاجر روسیوں کے لیے ماسکو میں ریشم کمخواب، سونا، جواہرات اور دیگر مصنوعات لاتے تھے۔ غیر ملکی تاجروں کے ساتھ غیر ملکی فن کار اور صنّاع بھی آئے۔ شہر کا ایک خاص حصّہ جہاں یہ غیر ملکی آکر مقیم ہوئے، کتائی گراڈ کے نام سے (یہی نام آج بھی ہے۔) یعنی چینی شہر موسوم ہوا۔ چوبی عمارات کی بدولت ماسکو اکثر نذرِ آتش ہوا۔ اوائل ایام میں ہیبت ناک آگ کے شعلوں نے اس کے پورے پورے محلّوں کو سلگتی ہوئی راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ مگر روسی ویسی ہی حیرت انگیز سرعت اور ہمت سے اسے پھر تعمیر کر لیتے اور اس طرح یہ شہر بڑھتا ہی گیا۔

سولھویں صدی آتے آتے ماسکو کی شوکت اتنی بڑھی کہ اس نے فرانس کے پایۂ تخت پیرس کا درجہ حاصل کر لیا۔ آبادی دو لاکھ ہوگئی اور یہ یورپ کے تمام شہروں کے لحاظ سے جو اس وقت چھوٹے تھے مقابلتہً بہت بڑی آبادی تھی۔ یُوری کے اخلاف شہزادگانِ ماسکو روسی ریاستوں کے تمام سربراہوں سے بڑھ کر دولت مند اور طاقتور تھے۔ بعض چھوٹے چھوٹے رئیس ماسکو کے حکمراں کے مقابلے کی تاب نہ رکھتے ہوئے اپنی ریاستیں اس کے سپرد کر دیتے تھے اور خود اس کی ملازمت اختیار کر لیتے تھے۔

جو اس کا تسلط نہ مانتے تھے بہ زورِ شمشیر مطیع کر لیے جاتے تھے اور اس طرح بہ قول روسی مؤرخین ماسکو نے رفتہ رفتہ "کئی رُوس یک جا کر دیے"۔ اس کے حکمران نے زار کا لقب اختیار کیا جو لاطینی لفظ سیزر بہ معنی شاہنشاہ سے مشتق ہے۔

اس طرح لاتعداد چھوٹی ریاستوں سے ماسکو کی عظیم اور مستحکم زاری سلطنت ایک واحد حکمراں کی زیرِ قیادت معرضِ وجود میں آئی جسے دوسری یورپی اقوام نے مسکوویا کا نام دیا۔

لیکن ماسکو میں چکر لگانے کے لیے ہم پھر اپنی ٹیکسی میں روانہ ہوتے ہیں کچھ راستہ آپ
کی ٹیکسی دریائے مسکووا کے ساتھ ساتھ جو شہر میں دو حلقے بناتا ہے چلتی ہے۔ سنگِ خارا کا
نہایت نفیس پُشتہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ پھر اسی پشتے کے ساتھ چلتے ہوئے آپ ایک
ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں ایک غیر معمولی حسین منظر سامنے آتا ہے۔ عین دریائے مسکووا
کے ساحل کے اس پار آپ کو آرے کی مانند دندانہ دار، ضخیم برجوں والی سیاہی مائل
سُرخ سنگِ خارا کی دیوارِ قلعہ نظر آئے گی۔ یہ بُرج اکثر چوکور ہیں اور بعض گول۔ فصیل
کے پیچھے خوبصورت اور عجیب و غریب محلّات کی چھتیں اور بہت سے گرجاؤں کے قبّے
اُبھرے ہوئے ہیں۔ یہ عمارات فصیل سے بلند ہوتی ہوئی رنگینی اور حُسن کا ایسا امتزاج ۳۱
پیش کرتی ہیں گویا وہ نئے نویلے بوقلموں، سنگین پھولوں کا گلدستہ ہیں جو گہرے رنگ
کے سنگِ خارا کی پٹی سے پھوٹ نکلے ہیں۔ شہر کے اس بہت بڑے تکون حصّے کو
جو کریملن کہلاتا ہے یہ دو میل لمبی دیوار احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کریملن جسے روسی کریمل کہتے ہیں تاتاری زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی قلعہ ہیں۔ یہ بارہ فٹ چوڑی کریملن کی دیوار (ماسکو کی دیوار) ماسکو کے عین وسط میں وہیں کھڑی ہے جہاں آٹھ سو سال قبل یوری کی بنائی ہوئی چوبی فصیل تھی۔ پندرھویں صدی کے اواخر میں لکڑی کی جگہ سنگِ خارا لگایا گیا۔ قلعہ جسے آپ اب دیکھتے ہیں ساڑھے چار

سو سال پرانا ہے اور کریملن کے اندر محلّات کا ہجوم بے قرینہ سہی مگر ان میں سے ہر ایک فنِ تعمیر کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حیرت انگیز ہے۔ بعض چھوٹے اور پرانے ہیں مگر اعلیٰ تناسب اور فن کاری کا ایسا نمونہ ہیں کہ وہ جواہرات کی مشرقی صندوقچیوں یا پریوں کی کہانیوں کے مُرقّعے معلوم ہوتے ہیں۔ جو بڑے اور جدید ہیں وہ بھی اثر آفریں ہیں۔ ان محلّات کے مابین جگہ جگہ بکھرے ہوئے گرجے مختلف النّوع اور بے حد خوبصورت ہیں۔ تاریخی لحاظ سے تمام سوویٹ یونین میں کریملن بڑا اہم مقام ہے۔ یہ فی الواقع روسی تاریخ کی ارضِ مقدس ہے۔ صدیوں تک روسی شہزادے اور زار ان محلّات میں قیام پذیر رہے اور دیوارِ کریملن کے عقب میں بیٹھے روس کی تاریخ بناتے رہے۔ ہاں یہ کریملن ہی تھا جہاں چار سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا دہشت ناک زار آئوان زر و جواہر سے مرصّع جگمگاتی زرق برق خلعتیں پہنے آہنی ہاتھ سے اپنی مملکت پر حکمرانی کرتا رہا۔ وہ اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل بڑا ذہین و قابل مگر نہایت مغموم اور ظالم زار تھا۔ آپ اس کے تجمّل و شان سے آراستہ کیے ہوئے کمرے اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ محلّات معرکہ خیز کارناموں اور ہیبت ناک جرائم کا مرکز رہے ہیں اور انہی میں بڑے بڑے پُر اسرار المیے واقع ہوئے ہیں۔

اب روسیوں کی سرزمین میں کوئی زار نہیں مگر ملک میں حکمرانی کا نظام کریملن کے مرکز سے ہی جاری ہوتا ہے۔ روس کے عظیم ترین محلّات اور سوویٹ حکومت کے دفاتر یہیں قائم ہیں۔ اسی جگہ عظیم کریملن کا مشہور و معروف سینٹ جارج ہال ہے جس میں سپریم سوویٹ جو امریکی کانگریس سے مشابہ ہے اپنے اجلاس منعقد کرتی اور روسیوں کے لیے قوانین وضع کرتی ہے۔ ۳۲

کریملن میں ہی سوویٹ یونین کا صدر غیر ممالک کے سفیروں کو شرفِ باریابی بخشتا

ہے ۔یوں کہیے کہ کریملن کو روسیوں کی سیاسی زندگی میں وہی مقام حاصل ہے جو وہائٹ ہاؤس اور واشنگٹن ڈی۔سی کی کیپٹل ہل کو امریکہ کی سیاست میں ہے ۔ رات کے وقت کریملن کے نوک دار برجوں سے سُرخ رنگ قمقموں کی روشنیاں چمکتی ہیں ۔سوویٹ حکومت کے یومِ انقلاب کے موقعوں پر پورا کریملن چراغاں سے جگمگا اٹھتا ہے ۔

دیوارِ کریملن کے ایک حصّے کے باہر کھلی جگہ پر ”سرخ چوک“ ہے ۔ اس کی تاریخی اہمیت وہی جو خود کریملن کی ہے ۔ اس کے ایک کونے میں سینٹ بسیل کا گرجا ہے ۔یوں تو ماسکو میں لاتعداد خوبصورت گرجا ہیں مگر سینٹ بسیل عجوبۂ عجائب ہے جو اسے پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں وہ حیرت سے فی الواقع کُھلے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اس عمارت کو سحر وافسوں کہیے ۔ اس کے نو برج جن پر ایک سے ایک مختلف نو قبّے ہیں یہ قبّے بوقلموں نقش ونگار اور ہلکی رنگین میناکار ٹائلوں کے بنے ہوئے ، طرحدار سنگین جھالر سے مزین مرغولہ دار ، رنگین مخروطی چکر ہیں جو آپ کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور طرّہ یہ کہ رنگ اور سنگ کی اس مرغولہ دار بھاری عمارت میں حیرت انگیز ہم آہنگی ہے ۔

اس میں ایک اسلوبِ فکر اور واضح منصوبہ پنہاں ہے ۔ دہشت ناک زار آئوان نے اس کلیسا کو روس کی مختلف ریاستوں کو ملاکر ماسکو کی ایک بڑی زاری مملکت میں بدلنے کی تجویز مکمل کرنے کے بعد بنوایا تھا ۔روسیوں کے ساتھ اہلِ فن لینڈ ، تاتاری اور لتھوانی پہلے ہی زاری مملکت میں جذب ہو چکے تھے ۔سینٹ بسیل کے معمار اِس عمارت کی صورت میں یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ تمام روسی جو پہلے مختلف ریاستوں
۴۴ اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اب ایک قوم بن گئے تھے اور اپنی عادتوں،معاشرت اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود ایک خدا اور احکم الحاکمین کے بندے ہیں ۔

دیوارِ کریملن کے قریب ”سرخ چوک“ میں ایک اور اَہم مگر قطعی مختلف نوعیت کی تعمیر ہے ۔یہ ایک متناسب مکعب شکل کی عمارت ہے جس کی بنیاد سے ملحق ٹھوس سنگین

سیڑھیاں ہیں۔ گہرے سُرخ پتھر کی بنی ہوئی صاف شفاف جدید طرز کی یہ عمارت لینن کا مقبرہ ہے۔

لینن ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا عظیم ترین قائد اور سوویٹ حکومت کا بانی تھا ۱۹۲۴ء میں اس کی وفات ہوئی اور اس کی حنوط کردہ لاش اس مقبرے میں دفن ہے۔ مگر پوری سوویٹ یونین میں آج تک اسی کے اُصولِ حکمرانی کار فرما ہیں۔ سوویٹ حکومت کے ارکان اور حکمران اشتراکی پارٹی کی نگاہ میں اس کا مقبرہ ایسا ہی تقدس مآب ہے جیسا دہشت ناک آئوان کے عہد میں سینٹ بیسل کا گرجا اہلِ مسکوویا کے لیے تھا۔

اس طرح دو بڑے مظاہر ایک تو قدیم روس کا اور ایک جدید یعنی موجودہ سوویٹ یونین کا ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر "سُرخ چوک" میں کھڑے ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں "سُرخ چوک" ماسکو کا عظیم بازار اور کاروباری مرکز تھا۔ مسکوویا کے باشندے یہاں جوق در جوق جمع ہوکر دن کا بیشتر حصّہ گزارتے تھے۔ تقریباً سارے چوک میں تاجروں کے خیمے اور چوبی حجرے تھے جن کی قطاروں کے درمیان تنگ راستوں پر لکڑی کے لٹھّے پہلو بہ پہلو زمین میں دبائے جاتے تھے تاکہ کیچڑ سے بچاؤ رہے۔ پھر بھی کیچڑ لٹھّوں کی درازوں سے باہر نکل آتی تھی۔ صبح سے شام تک ان رہگزروں پر بلند آواز سے بولنے والوں اور جوش میں ہاتھ اور دیگر اعضاء کو جنبش دینے والے مسکوویوں کا ازدحام رہتا تھا۔ چھوٹا بڑا ہر قسم کا کاروبار اسی مقام پر ہوتا تھا۔ یہاں گھوڑے، گائیں، گاڑیاں، سمور، پاپوش، وولگا کی تازہ مچھلی، یا دور دراز ہندوستان کے جواہرات سبھی کچھ بکتا تھا اور یہیں چینی دکاندار اخلاق کے ساتھ جھک کر ریشمی کپڑا گاہکوں کو پیش کرتا تھا۔ کچھ فاصلے پر حجاموں کی بے چھت دکانوں پر مسکووی اپنے سر کے بال اور داڑھیاں ترشواتے تھے۔ کبھی جھاڑو نہ لگنے کے سبب چوک کے اس حصّے میں لٹھّوں پر بالوں کی اتنی موٹی تہ جم جاتی تھی کہ چلتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا نرم گدّوں

پر قدم رکھ رہے ہیں۔ ہر بیچنے والا گاہکوں کو اپنے سامان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے ہم پیشہ کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ زور لگاتا تھا۔ ان کا دامن پکڑے اپنے خیمے میں لے جاتا تھا سودا چکاتے وقت دوکاندار اور گاہک ایک دوسرے سے بڑھ کر شور کرتے تھے۔

مگر "سرخ چوک" نرا بازار ہی نہ تھا۔ کریملن کی دیوار کے متصل زمین کے ایک قطعے میں جو تاجروں سے خالی رکھا جاتا تھا مجرموں کو سُولی دینے کی جگہ بھی تھی۔ ایسے دن بھی ہوتے تھے جب سُرخ وردیاں پہنے، دودھاری کلہاڑیاں اور تلواریں سونتتے ہوئے سپاہی کسی بدقسمت، پابہ زنجیر قیدی کو اس مہلک مقام کی طرف لے جاتے نظر آتے تھے۔ کئی صدیوں کے دوران میں لاتعداد انسانوں کے سر یہاں کاٹے گئے۔ اسی "سُرخ چوک" میں زار کے قاصد لوگوں کے سامنے کسی جنگ کے آغاز یا کسی شاہزادے کی ولادت یا ایسے ہی اور اہم سیاسی واقعات کا اعلان کرتے تھے۔ تاجروں، خریداروں اور رہگیروں کی ٹولیاں ان اعلانات اور مختلف افواہوں پر جو کریملن سے یہاں پہنچ جاتی تھیں بحث مباحثے کرتی تھیں۔ یوں یہ چوک مسکویوں کے لیے خاصا بڑا سیاسی کلب بن گیا تھا اور اگر شورشیں، بلوے، بغاوتیں برپا ہوتیں تو ان کا آغاز بھی "سرخ چوک" سے ہی ہوتا تھا۔

آج کل "سُرخ چوک" میں ایک اور قسم کی زندگی رواں دواں ہے۔ موٹر گاڑیاں اس کی ہموار سطح پر سے تیزی کے ساتھ گزرتی ہوئی ہر طرف کو جاتی ہیں۔ حکام اپنی فائلوں کے تھیلے اٹھائے ہوئے کریملن کی دیوار کے پھاٹکوں سے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آتے اور جاتے ہیں۔

یہ چوک اب بھی ماسکو کی عوامی زندگی کا مرکز ہے۔ تمام عظیم عوامی مظاہرے یہیں ہوتے ہیں۔ یہاں ماسکو کے لاکھوں کارکن جھنڈے، پھریرے اور بینڈ لیے یکم مئی کو پریڈ کرتے ہیں۔ سوویٹ یونین میں یوم مئی بڑی بھاری قومی تقریب ہے۔ عام اور اولمپک کھیل کے

مقابلوں میں حصّہ لینے والے نوجوان مرد اور عورتیں اپنے اپنے خاص نشانات کے علَم بلند کیے ہوئے سفید لباس میں ملبوس "سرخ چوک" سے مارچ کرتے ہوئے گزرتے ہیں ۔ ۳۵
سوویٹ فوج بھی یہاں اپنی مشقیں کرتی ہے ۔ پیادہ فوج کی شانہ بہ شانہ قطاریں ایک جسم کی طرح مارچ کرتی ہیں ۔

خوبصورت وردیوں میں ملبوس قفقاز کے پہاڑی قزاقوں کے گھڑ سوار دستے، ٹینکوں کی لمبی قطاریں ، ہلکا اور بھاری توپ خانہ اور آسمان پر جنگی طیاروں کے بادل یہ سب ایک قابلِ دید نظّارہ ہوتا ہے ۔

ماسکو سے شاید آپ لینن گراڈ جانے کا ارادہ کریں جو بذریعہ ریل صرف ایک رات کا سفر ہے ۔ یقیناً یہ بیکار نہیں ہوگا کیونکہ سوویٹ یونین میں تیس لاکھ کی آبادی والا لینن گراڈ دوسرا عظیم ترین شہر ہے ۔ یہ ماسکو کے شمال میں بحیرۂ بالٹک کے ایک بازو خلیج فن لینڈ پر واقع ہے اور ۱۹۱۷ - ۱۷۱۴ء یعنی دو سو سال تک ماسکو نہیں بلکہ یہ شہر روسی حکومت کا دارالحکومت رہا ہے ۔

ماسکو کی نسبت لینن گراڈ کم عمر ہے ۔ یہ نیویارک سے بھی بعد میں آباد ہوا ۔ ۱۷۰۳ء میں زار پیٹر اعظم نے اس کی بنیاد ڈالی اور اسی کے نام کی نسبت سے یہ سینٹ پیٹرزبرگ یا پیٹرز برگ کہلایا ۔ ۱۹۲۴ - ۱۹۱۴ء تک اسے پیٹرو گراڈ کہتے رہے اور پھر مشہور سوویٹ رہنما کے اعزاز میں اس کا پہلا نام بدل کر لینن گراڈ رکھا گیا ۔ یہ ماسکو کے برابر کا اہم صنعتی مرکز ہے ۔ اس کے مضافات میں چھوٹے بڑے کارخانوں کی کمی نہیں ۔

مزید برآں یہ بہت بڑی سوویٹ بندرگاہ بھی ہے اور سب سے زیادہ قابلِ قدر خوبی یہ ہے کہ اسے روس کا عظیم ترین علمی مرکز ہونے کا فخر ہے ۔ اس ضمن میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں فقط اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی تعداد چالیس ہے ۔

لینن گراڈ بے حد خوبصورت شہر ہے مگر ماسکو سے اس کے حُسن کی نوعیت مختلف ہے ۔

یہاں آپ کو ماسکو کی پیچدار گلیوں کی بھول بھلیاں اور بند گلیاں نہ ملیں گی۔ لینن گراڈ
کی سڑکیں اور شاہراہیں بالکل سیدھی، عریض اور نیو یارک کی طرح ایک منصوبے کی
تحت بنائی گئی ہیں۔ نہ ہی لینن گراڈ میں ایسی مشرقیت اور قدامت کے آثار ہیں جو ماسکو میں
سیاحوں کو کھینچتے ہیں۔ بحیرۂ بالٹک کا یہ عظیم شہر مغربی سراسر یورپ کے نمونے پر ہے۔
اس کی بعض عمارات پیرس اور سٹاک ہوم سے ملتی جلتی ہیں اور جہاں ماسکو عجوبۂ ۳۶
روزگار اور تبسم ریز ہے لینن گراڈ سرد مہر اور متین معلوم ہوتا ہے۔

پاٹ دار دریائے نیوا لینن گراڈ کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ سمندر میں گرنے سے پہلے
شہر کے اندر یہ بہت سی شاخوں میں بٹ جاتا ہے اور اس طرح وہ جزیرے بنتے ہیں جن
پر لینن گراڈ کا کچھ حصہ واقع ہے۔ علاوہ بریں شہر میں کئی اور چھوٹے چھوٹے دریا اور نہریں
ہیں جو اس کی زیبائش اور کشش کو دوبالا کرتے ہیں۔ ان کے پُرسکون نیلگوں پانی میں منعکس
ہو کر لینن گراڈ کی عمارات دوگنی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ حسین عمارتوں سے یہ شہر مالا
مال ہے۔

بڑی بڑی جدید عمارتوں اور خوبصورت مکانوں سے یہ شہر آراستہ ہے۔ انقلاب
سے پہلے یہ متمول روسی اُمراء اور صنعت کاروں کی املاک تھیں۔ لینن گراڈ شاندار محلّوں
کا شہر بھی ہے۔ روس کا دارالحکومت بننے کے وقت سے زار اور شاہی خاندان کے بیشتر
افراد ان میں رہتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لینن گراڈ کے عام ماحول کی طرح یہ محل بھی ماسکو
سے مختلف ہیں۔ ان میں روسی فنِ تعمیر کی رعنائی و رنگینی کی کوئی جھلک نہیں۔ یہ اٹھارہویں
صدی کے مستقیم، خوبصورت، متناسب خطوط والے مغربی یورپی محلّوں کا نمونہ ہیں جن
میں قطار اندر قطار بڑے بڑے دریچے، گول اور چوکور ستون اور بہت سے مجسمے ہیں۔ ان
محلّوں کا پُورا جھرمٹ ایک مقام پر دریائے نیوا کے کنارے ہے جس سے استحکام، عظمت اور
مغرور حسن کا تاثر طاری ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ روئے زمین پر یہ مقام اپنا ثانی

نہیں رکھتا۔

اس عظیم شمالی شہر کے آغاز کے متعلق بھی ایک خاصی ڈرامائی داستان ہے۔ لینن گراڈ کا بانی پیٹر اعظم بڑے معرکے کا شخص تھا۔ بلند قامت اور تنو مند۔ اس کا دل و دماغ بھی اس کے جسم کی طرح توانا اور تیز طرار تھا۔ اس کی جسمانی توانائی اور قوتِ ارادی ناقابلِ تسخیر تھی۔ زار بنتے ہی اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کے ملک کو بحیرۂ بالٹک میں ایک محفوظ بندرگاہ کی ضرورت ہے۔ روس سرعت کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا اور اس کے لیے مغربی یورپ کی اعلیٰ اور ارفع مہذب اقوام کے ساتھ مراسم
قائم کرنا اور تجارتی تعلقات بڑھانا اشد ضروری تھا۔ لیکن ۱۴۵۳ء میں ترکوں کے قسطنطنیہ ۳۷
فتح کر لینے کے بعد روس کے لیے ان اقوام کے ساتھ بحیرۂ اسود کے راستے تجارت ناممکن ہو گئی۔ اس کے پاس دریائے ڈوینا کا واحد تجارتی راستہ رہ گیا تھا اور بحیرۂ ابیض کے کنارے آرکینجل کی چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ مگر یہ راستہ بہت طویل اور دشوار گزار تھا۔ کیونکہ بحیرۂ ابیض کے شمال میں سال کے بیشتر حصے میں پانی منجمد رہتا تھا۔ ان حقائق نے پیٹر کی توجہ بالٹک کی طرف مبذول کی۔ یہ راستہ مغرب کے ساتھ روسی تجارت کے لیے بہترین اور مختصر ترین تھا۔ اس لیے اس سمندر پر ایک مفید بندرگاہ کی تعمیر پیٹر کی زندگی کا خواب بن گیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بالٹک کے ساحل سویڈن کی ملکیت تھے اور اہلِ سویڈن اور روسیوں کے تعلقات بالعموم مخالفانہ تھے۔

پیٹر نے سویڈن کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی ٹھانی۔ سویڈن اس وقت بڑا جنگجو اور طاقتور ملک تھا۔ اس لیے روسیوں کے لیے یہ جنگ طویل اور بڑی دشواریوں کا باعث بن گئی آغازِ کار میں پیٹر کو پے در پے سخت شکستیں ہوئیں لیکن بالآخر وہ اپنے سخت جان اور سخت کوش مخالف کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اہلِ سویڈن نے بالٹک کا جنوبی حصہ روس کو دے دیا۔ زار کا خواب اب پورا ہونے کو تھا کیونکہ

اسے ایسی بندرگاہ بنانے کا موقع میسّر آگیا جس کی اس کے ملک کو اشد ضرورت تھی۔ لیکن جب
۱۷۰۳ء میں پیٹر نے لینن گراڈ کے موجودہ محلِ وقوع کو پہلی بار دیکھا تو اسے دریائے نیوا کے
دہانے میں سوائے شمالی اُجاڑ دلدلوں کے اور کچھ منظر نہ آیا اور اس کے گرد و نواح میں بھی
کوسوں تک مزید دلدلیں اور صنوبر کے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ جب اس نے اپنے امراء
کو بتلایا کہ مَیں یہاں ایک ایسا بڑا شہر آباد کرنا چاہتا ہوں جو "یورپ میں داخل ہونے کے
لیے کھڑکی" ثابت ہو تو اکثر نے اسے دیوانہ سمجھا۔ مگر پیٹر جیسے شخص کو مصائب اور دشواریاں
روک نہیں سکتی تھیں۔ اس نے ہزارہا کسانوں کو روس کے مختلف حصّوں سے یہاں دھکیل
دیا۔ یخ سی ٹھنڈی کیچڑ میں کمر تک دھنسے ہوئے وہ لکڑی کے تختے اور لٹھے لاد لائے
اور دلدل میں گاڑ کر ان پر گاڑیاں بھر بھر ریت اور مٹّی ڈالی۔ اس مشقت میں سینکڑوں
نے جانیں دے دیں ان کے بنائے ہوئے مکان بھی اکثر بیٹھ جاتے۔ ان ایام میں جب
مشینوں اور کلوں کی مدد نہ مل سکتی تھی یہ کام بڑا ہیبت ناک تھا۔ مگر ہر دفعہ نئے آدمیوں
۳۸ نے مرنے والوں کا کام سنبھال لیا۔ خود زار نے اکثر اوقات ایک معمولی مزدور کی طرح
کام کیا۔ وہ کسی قسم کے کام کو حقیر یا شان کے خلاف نہ سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ پانی
پر قابو پا کر اسے نہروں میں نکال دیا گیا۔ پھر مکان اور گلیاں وجود میں آئیں اور
ساتھ ہی نئی مشکلات بھی۔ زار پیٹر شہر پیٹرز برگ کو پتھر کا بنانا چاہتا تھا۔ اب
تک ماسکو کا بیشتر حصّہ لکڑی کا تھا۔ وہ لکڑی کے شہروں اور ان کی آئے دن کی
آتش زدگی سے عاجز تھا۔ مگر پیٹرز برگ کے قرب و جوار میں کوئی پتھر کی کان نہ تھی۔
پیٹر نے ایک عجیب و غریب تجویز کی یعنی پتھّر ٹیکس لگایا۔ یعنی نئے شہر میں داخل
ہونے والے ہر جہاز کے لیے لازم تھا کہ عمارتی پتھروں کی مقررہ تعداد پیش کرے۔

یوں یہ پتھر کا نیا شہر بڑی سرعت کے ساتھ دلدلوں میں سے اُبھر آیا۔ ۱۷۲۵ء
میں جب پیٹر نے وفات پائی تو یہ ایک عظیم اور شاندار شہر بن چکا تھا۔ دُنیا کے ہر

حصّے سے جہاز اس بندرگاہ میں روس کے ساتھ تجارت کے لیے جمع ہونے لگے۔ بیشتر شاہی قصر اور کئی ایک دوسری شاندار عمارات جنھیں آپ آج لینن گراڈ میں دیکھتے ہیں۔ ان کا منصوبہ اور تعمیر زار پیٹر ہی کی مرہون ہے۔ اس کے جانشینوں کے لیے صرف اس کے تکمیل کرنے کا ہی کام رہ گیا تھا۔ پیٹر نے شہر کے بہت سے حصّے کا نقشہ خود ہی بنایا تھا۔ اس کی موت بعد بھی یہ اس کے حکم کے مطابق ہی بڑھتا اور پھیلتا رہا اس نقطۂ نگاہ سے یہ آج بھی اس عظیم الشان ہستی کی خداداد فراست اور قوتِ ارادی کا مرقّع ہے۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا لازم ہے کہ پیٹر کے وقت سے روسی زاروں نے اپنے تیئں شہنشاہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ بعض روسی مدّتوں تک شکایتاً یہ کہتے رہے کہ پیٹرز برگ روسیوں کی ہڈیوں پر تعمیر ہوا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک حقیقت بھی تھی کیونکہ اس شہر کی تعمیر نے انسانی جانوں اور آنسوؤں کی بڑی قربانی لی تھی۔ مگر روسیوں کی جو خدمات یہ شہر بجا لایا ان سے قربانیوں کا اچھّا صلہ مل گیا۔ یورپ میں دروازہ کھلنے سے روس کی ترقی کو ایک زبردست ریلا ملا۔ مغربی ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کی بدولت ایسا ولولہ پیدا ہوا کہ زار کی سلطنت بیش از پیش سُرعت سے ترقی کرتی چلی گئی۔

دریائے نیوا کے کنارے واقع دو محل جو ایک گلی سے آپس میں وابستہ کیے
گئے ہیں "سرمائی محل" اور "کتبا" کے نام سے مشہور ہیں اور دونوں کو ملا کر ان ۳۹
کے صحن کا رقبہ روئے زمین کے تمام محلات سے بڑھ جاتا ہے۔ چونکہ اب وہ عوام کے لیے تاریخی مقامات کی حیثیت سے کھلے ہیں آپ انھیں جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ "کتبا" میں نقرئی ظروف، فنّی صنعت کاری اور بالخصوص مصوّری کا انتہائی حسین اور عظیم ذخیرہ ہے۔ آپ مزیّن ایوان سے گزرتے جائیں تو پورے ایک میل کی مسافت تک مصوری اور نفیس نقش و نگار کے دلربا مناظر کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ یہ تصویریں بہترین کہنہ مشق

لاطینی، ولندیزی، فرانسیسی اور دوسرے نقاشوں کے فن کا شاہکار ہیں ان میں سے بہت سی تصویریں ایسی بے بہا ہیں کہ ہر ایک کو خریدنے کیلئے خزانہ درکار ہوگا۔ یہ بیش قیمت سرمایہ کچھ تو پیٹر کا جمع کردہ ہے لیکن بیشتر اس کے جانشینوں کا۔

"سرمائی محل" زار کی خاص الخاص شہری اقامت گاہ تھی۔ اس کے بعض باقاعدہ پذیرائی کے کمرے اتنے وسیع ہیں کہ ان میں ہزاروں آدمی سما سکتے ہیں۔ ان کے آئینہ کی طرح چمکتے ہوئے چوبی تختیوں کے فرش اعلیٰ منبّت کاری کے نقوش سے مزیّن ہیں اور ان میں قیمتی پتھروں اور سونے کے گلدان، بیش بہا فرنیچر، چھت کی ملمّع کاری سنگ تراشی اور نقش و نگار منعکس ہوکر کیف آور سماں پیدا کرتے ہیں۔ ان کمروں کی شان و شوکت، تجمل اپنی جگمگاہٹ سے نگاہ کو خیرہ کر دیتی ہے۔ "سرمائی محل" اٹھارہویں صدی کے شہنشاہوں کی بُود و باش کا واضح منظر پیش کرتا ہے۔

پیٹر کی زندگی بہت سادہ تھی مگر اس کے جانشینوں کے عہد میں روسی دربار کا کرّوفر شاہانِ فرانس کے دربار پر بھی سبقت لے گیا۔ پیٹر کے چالیس سال بعد جب ملکہ کیتھرائین کا عہد شروع ہوا تو اس کی رقص کی تقریبوں کا شہرہ پورے یورپ میں پھیل گیا۔

زندگی کی یہ لہریں عین اس مقام پر اُٹھ رہی تھیں جہاں پچاس سال پہلے پیٹر نے اجاڑ، بھیانک شمالی دلدلوں کے سوا کچھ نہ پایا تھا۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد لینن گراڈ، ماسکو اور دیگر مقامات کے تمام محلّات سوویٹ حکومت نے قبضے میں لے لیے ان میں سے بعض عجائب گھر بنا دیے گئے اور بقیہ حکومت کے دفاتر، مدارس اور ملازمین کلبوں کا کام دے رہے ہیں۔ لینن گراڈ کے مضافات میں بھی ماسکو کی طرح ان لوگوں کے لیے جدید قسم کے مکان بن گئے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران لینن گراڈ پر بڑی مصائب نازل ہوئیں۔ ۱۹۴۱ء

کے ہبوط میں جرّار جرمن افواج گولہ باری کرکے اتنی قریب آگئیں کہ شہر صاف نظر آتا تھا۔ مگر روسی فوج اور لینن گراڈ کے شہری ہتھیار بند ہوکر اس دلیری اور مستقل مزاجی کے ساتھ مزاحم ہوئے کہ دشمن ہلّہ بول کر بھی سر نہ کر سکا۔ حملہ آوروں نے شہر میں رسد کی ناکہ بندی سے یعنی فاقوں مار کر اسے اطاعت پر مجبور کرنا چاہا۔ انھوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال دیا اور شہر کو نرغے میں لے لیا۔ لینن گراڈ کو بقیہ روس کے ساتھ ملانے والی ریل کی تمام سڑکیں دشمن نے قبضے میں لے لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی قسم کا سامانِ خوراک، جنگی اسلحہ، بارود وغیرہ محصور شہر کو بذریعہ ریل بہم پہنچانا ممکن نہ رہا۔ نہایت قلیل مقدار میں جو کچھ مہیا کیا گیا وہ باربردار طیّاروں اور جھیل لڈوگا کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے آیا۔ بسا اوقات یہ کشتیاں نازی بمباروں نے ڈبو دیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دشمن کی توپوں نے صنعتی حصّوں اور خود شہر پر دھڑا دھڑ گولے برسائے اسٹوکا بمبار متواتر حملے کرتے تھے۔ ۴۰

اس طرح لینن گراڈ دو سال سے زائد عرصہ محصور رہا۔ قحط اتنا شدید تھا کہ بھوک کے مارے ہوئے نحیف و نزار لوگ سڑکوں پر چلتے پھرتے سائے معلوم ہوتے تھے اور چوہے بلیاں تک کھا لیتے تھے۔

قریباً دس لاکھ افراد بھُوک اور نازیوں کے گولوں کی نذر ہو گئے۔ ان آفات پر شدید سردی نے اضافہ کیا۔ شہر میں کوئلہ نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے مکان گرم نہ ہو سکتے تھے۔ اسکولوں میں بچّے پنسلوں سے لکھتے تھے کیونکہ سیاہی منجمد ہو جاتی تھی۔ جرمن کیمپ سے لاؤڈ سپیکروں پر بار بار "ہتھیار ڈال دو، مزید مدافعت بے کار ہے" کا اعلان سنایا جاتا تھا۔ مگر لینن گراڈی ایک لمحے کے لیے بھی ہتھیار ڈالنے کا خیال دل میں نہ لائے۔

کہیں جنوری ۱۹۴۴ء میں جاکر "سرخ فوج" شہر کے گرد نازیوں کے ڈالے ہوئے

قوس نما آہنی حلقے کو توڑ سکی ۔ ہٹلر کی افواج کو ان کے مستحکم ، محفوظ اور مضبوط مورچوں
نکالا اور تعاقب کر کے بھگا دیا گیا ۔ لینن گراڈیوں نے چھٹکارا پاکر کتنی مسرت محسوس کی
آپ شاید اس کا تصوّر ہی کر سکیں گے ۔

مگر اس اثناء میں لینن گراڈ کے ہر دسویں گھر کو دشمن کی گولہ باری سے گزند
پہنچا یا بالکل منہدم ہو کر کھنڈر بن گیا ۔ جنگ کے بعد روسیوں نے زبردست ہمت
اور محنت کے ساتھ انھیں از سرِ نو تعمیر کیا اور اب اس ہولناک تباہی و بربادی کا جو
دشمن نے چاروں طرف پھیلائی تھی کوئی نشان باقی نہیں رہا ۔ شہر کے گرد کارخانوں کی ۱۴
چمنیوں سے پھر دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے ہیں ۔

یہ ایک معجزہ ہے کہ لینن گراڈ کے شاہی محلوں پر آنچ نہیں آئی ۔ بعضوں کو گولے لگے مگر گزند
کم ہی پہنچا ۔ وہ اسی طرح پوری آن بان سے ، پُر سکون ، پُر عظمت پیٹر کے شہر کی بلندیوں پر
فخریہ سر اٹھائے دریائے نیوا سے نکلے ہوئے ٹھنڈے یخ کہرے میں تیرتے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں ۔

آپ نے روس کا یہ سفر گرمیوں میں کیا ہے ۔ جاڑوں میں یہ تمام مقامات جو آپ
نے دیکھے ہیں برف کے لحاف تلے ڈھکے ہوں گے ۔ آپ کو جنگل میں ہر درخت کی ٹہنیوں
پر برف کی سفید نفیس جھالر ، برقی تاروں پر برف کی سیدھی دھاریاں ، لامتناہی برفانی میدان
دیہاتی اور شہری مکانات کی چھتوں پر برف کی موٹی تہ نظر آئے گی ۔

آپ نے بلاشبہ سوویٹ یونین کے متعلق سنا ہوگا کہ وہ سخت سردی اور کہر کا ملک
ہے ۔ ہر بڑے ملک اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی طرح روس میں کئی قسم کی آب و ہوا
ہے ۔ آپ کو آئندہ صفحات سے معلوم ہوگا کہ اس میں معتدل گرم اور شدید گرم علاقے
بھی ہیں ۔ لیکن روس کا بیشتر حصّہ سرد ہے ۔ موسم گرما معمولی گرم ہوتا ہے مگر مدت قلیل ہے ۔
جاڑا طویل اور شدت ہوتا ہے ۔

ماسکو کے گرد و نواح میں جولائی کا مہینہ نیو یارک کی طرح گرم ہوتا ہے البتہ اتنا مرطوب نہیں۔ اگست کے اواخر میں دن تو کچھ گرم ہی ہوتے ہیں لیکن راتوں کو کُہر پڑنے لگتی ہے۔ برف باری اکتوبر میں شروع ہو جاتی ہے وسط نومبر میں درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جاتا ہے اور ماہ مارچ کے آخر تک وہیں رہتا ہے۔ اس وجہ سے جو برف باری وسط نومبر کے بعد ہوتی ہے وہ پگھلتی نہیں۔ اس کی تہیں دبیز تر ہوتی جاتی ہیں اور یہ سر زمین اپنے اس چُست سفید براق لباس میں پورے ساڑھے چار ماہ تک ملبُوس رہتی ہے۔ بعض اوقات درجۂ حرارت صفر سے بھی تیس درجے نیچے گر جاتا ہے۔ ماسکو کے شمال مغرب میں یورپی روس کے علاقوں اور بالخصوص سائبیریا میں جاڑے بہت طویل اور بے حد سرد ہوتے ہیں۔ روئے زمین کے سرد ترین علاقے سائبیریا میں واقع ہیں

سرد ملک میں زندگیاں بسر کرنے کی بدولت روسی برف سے مانوس ہیں۔ وہ ۴۲
اس میں رہنا، اس میں کھیلنا، اس کے مطابق لباس پہننا اور اس سے استفادہ کرنا کرنا جانتے ہیں۔ برفانی علاقے میں وہ گرم بنیان، بھاری سمور دار کوٹ اور برفانی پاپوش (جو ویلینکی کہلاتی ہے) پہنتے ہیں۔

روسی بچّوں کے لیے موسم کی پہلی برف باری ایک خوش آئند تقریب ہے۔ ان کے جاڑے کے سب کھیل برف سے اور برف میں ہی ہوتے ہیں۔ سکولوں سے واپس آتے ہوئے بچّے راستوں پر برف کے گولوں سے پُرجوش جنگیں لڑتے ہیں۔ ٹیلوں سے پانی بہا کر جو فوراً جم جاتا ہے لڑکے بلند برفانی تودے بناتے ہیں اور بے پہیا گاڑیوں میں بیٹھ کر ان پر سے نیچے پھسلنا بڑا پُرلُطف رہتا ہے۔ برف سے بڑے بڑے انسانی مجسّمے بنائے جاتے ہیں جو بہت دیر تک قائم رہتے ہیں اور برف پر دوڑنے بھاگنے اور پھسلنے کی تو کوئی حد ہی نہیں۔

بچّوں کے علاوہ بڑوں کے لیے بھی موسم سرما اپنی خوشیاں لاتا ہے۔ برف

گاڑیوں کے ذریعے برف پر سے گزرنا بہت خوش کن مشغلہ ہے۔ برف پر سواری کے ذریعے گزرنے کے لیے ہلکی مخصوص بے پہیا گاڑیاں ہیں جن پر آپ بھاری سمور کے جُوتوں میں پاؤں لپیٹے اور ٹانگیں خوب گرم کیے بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ تین تیز رفتار گھوڑے ان گاڑیوں میں جُتتے ہوتے ہیں اس لیے انھیں "تروئیکا" کہتے ہیں۔ چاندکی چاندنی میں ترو ئیکا کی سواری سے انسان بڑا لطف اندوز ہوتا ہے۔

ریل کی سڑکوں سے پہلے روس میں برف مواصلات کا بہترین ذریعہ تھی۔ منجمد دریاؤں پر کشتیاں چل نہیں سکتیں لیکن یہ یخ بستہ دریا بے پہیا گاڑیوں کے لیے بڑے بڑے اچھے راستے مہیا کرتے ہیں۔ بہار و خزاں کی بارشیں ملک کی کچّی سڑکوں کو چکنے والی کیچڑ کا سمندر بنا دیتی ہیں۔

بیل گاڑیاں اور چھکڑے اس کیچڑ میں دُھرے تک دھنس جاتے ہیں۔ لیکن جب وہی سڑک کُہر جم جانے سے سخت ہوجاتی ہے اور برف کی تہیں اس پر نرم گدّے بچھا دیتی ہیں تو گھوڑا سامان سے بھری ہوئی برفانی گاڑی کھینچتے ہوئے بھی آسانی کے ساتھ دوڑ سکتا ہے۔

اسی بناء پر گزشتہ صدیوں میں روسی موسم سرما کو سڑکوں کا بہترین معمار سمجھتے تھے۔ اب بھی جاڑوں میں بالخصوص دیہات میں روسی لوگ ٹرکوں کے علاوہ بے پہیا گاڑیوں کا بہت کچھ استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کِسان باربرداری کا زیادہ تر کام انہی سلیجوں سے لیتے ہیں۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ماسکو کی مصروف شاہراہوں پر آپ کو برف کبھی نظر نہیں آئے گی۔ وہاں تو اس کا وجود بھاری رکاوٹ ہوگا۔ اس لیے جیسے ہی برف گرتی ہے فی الفور ٹرکوں میں ڈال کر ہٹادی جاتی ہے۔

باب ۔ ۳

کیف سے سمرقند

بالفرض آپ لینن گراڈ سے روانہ ہو کر یورپی روس کے انتہائی شمال میں بحیرۂ ابیض کی بندرگاہ آرکینجل جاتے ہیں۔ وہاں سے بحرِ منجمد کے لامتناہی ساحل کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب پرواز کرتے ہوئے آپ سائبیریا کے آخری شمال مشرقی منطقے میں پہنچتے ہیں۔ ان سب کے گردِ چکّر کاٹ کر مشرق اقصیٰ کی سمت طیّارہ ولادی واسٹک کے اڈّے پر جہاں سے آپ نے روس کے دورے کا آغاز کیا تھا اُترتا ہے۔ سوویٹ یونین کے شمالی حاشیے کے ساتھ ساتھ ایسی پرواز ایک نادر تجربہ ہوگا۔

یہ دورہ آپ کو ایک وسیع و عریض، غیر معروف اور منجمد دنیا کی جو سوویٹ یونین کے اندر واقع ہے، عجیب و غریب زندگی سے واقف کرے گا۔ موسمِ سرما میں یہ دنیا ٹھوس منجمد رات کی ہے جو سات آٹھ ماہ تک چھائی رہتی ہے یہاں شمالی قطبی شعاعوں کی جھلملیوں، غیر محدود برف پوش وُسعتوں اور رینڈیر گاڑیوں کی مواصلات دیکھیے۔ مختصر موسمِ گرما میں جب آفتاب اسی فیاضی سے روشنی عطا کرتا ہے کہ چار پانچ ماہ تک دن ہی دن ہوتا ہے یہ سرزمین اجاڑ، بیابانوں کی، گھاس اور جنگلی پھولوں سے ڈھکی ہوئی ٹنڈرا کی دلدلوں کی، ان بوں پرندوں کی جو اطراف عالم سے یہاں آن جمع ہوتے ہیں اور شکاریوں اور ماہی گیروں کی دنیا بن جاتی ہے۔

اس عظیم و وسیع خطّۂ عالم میں انسانی آبادی نہایت قلیل ہے۔ چھوٹی چھوٹی انسانی بستیاں صرف دریاؤں کے دہانوں اور سمندری ساحلوں کے ساتھ ساتھ دور دراز فاصلوں

پر واقع ہیں۔

حوصلہ شکن مشکلات سے بھرپور یہ دنیا بھی اب راہِ ترقی پر گامزن ہے۔ اس کی منجمد سرزمین میں دھات کی دولت کے بہت بڑے دفینے دریافت ہوئے ہیں۔ مثلاً یورپی روس کے انتہائی شمال میں وَرکُتا کے نواحی علاقے میں تیل اور کوئلے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں۔ سائبیریا کے انتہائی شمال کے مختلف حصّوں میں بھی تیل موجود ہے اسی مقام پر بعض علاقوں میں سونا اور دوسری قیمتی دھاتیں دریافت ہوئی ہیں بحری
۴۴ بندرگاہیں، فضائی اڈّے اور بجلی کے کارخانے بحرِ منجمد کے عظیم ساحل کے ساتھ ساتھ قیدیوں کی مشقت اور محنت سے بنائے گئے ہیں۔ منطقۂ بحرِ منجمد کا سفر دلچسپ سیاحت ضرور ہے مگر یکسانیت کی وجہ سے اکتا دیتا ہے۔ روسی قومی معاشرے کی شاہراہ (ریل) اس وقت وہاں سے نہیں گزرتی۔ برعکس اگر آپ سوویٹ یونین کے جنوبی علاقوں سے ہوکر ماسکو سے ولادی واسٹک واپس ہوں تو آپ کو اس سے کہیں بہتر مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ اس لیے آپ ماسکو سے جنوب مشرق کی طرف جانے والی ریل گاڑی پر سوار ہوں۔ یہ آپ کو تقریباً سولہ گھنٹے میں یوکرین کے دار الحکومت کِیف میں پہنچا دے گی۔

یوکرین یا روس کوچک جیسا کہ وہ پہلے مشہور تھا بذاتِ خود جرمنی کے لگ بھگ ایک وسیع ملک ہے اور سوویٹ یونین کا نہایت اہم حصّہ ہے۔ جنوب میں یہ بحیرۂ اسود اور بحیرۂ ایزوف کے ساحلوں سے جا ملا ہے۔ یوکرین کا لفظ 'اوکرینہ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی روسی زبان میں سرحد یا سرحدی علاقہ ہے۔ یہ وجہ تسمیہ محلِّ وقوع کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ یوکرین کے مغرب میں پولینڈ اور رومانیا کے ملک ہیں اور بحیرۂ اسود کے پار ترکیہ ہے۔

کیف کے قرب وجوار میں پہنچ کر جنوب کے تاثرات محسوس ہونے لگتے ہیں۔ مرکزی روس یا سائبیریا کی نسبت یوکرین میں فطرت کہیں زیادہ دوست دار اور

خوش آئند ہے۔ یہ ایک شاداب، سرسبز اور بے حد حسین علاقہ ہے جہاں قدرت اپنی مسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ یوکرین کے جاڑے مقابلتہً معتدل ہیں۔ برف صرف تین ماہ تک رہتی ہے اور کہر شاذ ہی شدید ہوتا ہے۔ بیشتر شاہ بلوط اور دیودار کے درختوں سے معمور جنگلات صرف یوکرین کے شمالی حصے اور کیف میں ہیں۔ جنوب کا علاقہ فراخ اور شاداب مزروع ہے۔ یوکرین کی سیاہ اور زرخیز زمین کا شہرہ عام ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے یہ خطہ اس قدر گیہوں، جو، اناج، سبزیاں اور پھل پیدا کرتا تھا کہ اسے "روس کا کھلیان" کہتے تھے۔ حق یہ ہے کہ زرعی لحاظ سے یہ علاقہ سوویٹ یونین کے لیے والگا اور مغربی سائبیریا کے کوبئی یشو رقبہ سے بھی کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے
یہ وسیع پیمانے پر رتالو کی فصلیں بھی پیدا کرتا ہے۔ روس میں شکر تقریباً تمام کی تمام ۷۵
اسی پودے سے تیار کی جاتی ہے اور ساری مقدار یوکرین ہی مہیا کرتا ہے۔ ریل کے سٹیشنوں پر یوکرینی کسانوں میں سے بعض اسی کی بوریاں اٹھائے ہوئے گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ جنوب کے تاثرات ان میں بھی نظر آتے ہیں وہ اس طرح کہ ماسکو والگا یا سائبیریا کے "عظیم روسی" زیادہ تر گورے رنگ اور سنہری بالوں والے ہیں۔ یوکرینیوں کی آنکھیں بھوری اور بال سیاہ ہیں۔ مرد سروقامت اور قوی الجثہ ہیں۔ یوکرینی کسان عورتیں، کشیدہ کاڑھے ہوئے کرتے پہنتی ہیں اور سروں پر رومال باندھتی ہیں گلے میں موتیوں کی لڑیاں ہوتی ہیں جو انہیں بہت زیب دیتی ہیں۔

یوکرینیوں کا نسب "عظیم روسیوں" کے ساتھ ملتا ہے۔ مگر وہ اپنی ایک علیحدہ زبان بولتے ہیں جسے "عظیم روسی" بلا تکلیف سمجھ لیتے ہیں۔ پھر بھی اس کی اختلافی نوعیت واضح ہے۔ یوکرینیوں کا کردار پرکشش ہے جس میں کچھ جنوب کی کاہلی بھی اثر انداز ہے اور جو مسکو یا والوں میں مفقود ہے۔ یوکرینی تھوڑی بہت ہٹ دھرمی کے لیے بھی بدنام ہیں اور ان کی تیزی طراری اور بذلہ سنجی جو آئرلینڈ والوں کی یاد دلاتی ہے پورے

روس میں مشہور ہے ۔

یوکرینی دیہات بڑے صاف ستھرے اور دلپذیر ہیں ۔ کسانوں کے مکانوں کی پلستر شدہ دیواریں بڑی صفائی سے قلعی کی ہوتی ہیں ۔ البتہ سیاہی مائل تیلیوں کی چھتوں سے گنوار پن ٹپکتا ہے ۔ ترکاریوں کے کھیت اور چیری اور دوسرے پھلوں کے باغ ہر جگہ موجود ہیں ۔ گاؤں کے قریب بید مجنوں سے گھرا ہوا تالاب ہوتا ہے ۔

یوکرین میں آبادی ایسی ہی گھنی ہے جیسی ماسکو کے علاقے میں ۔ زیادہ تر زراعتی ملک ہونے کے باوجود یہ صنعتی دولت سے بھی مالا مال ہے ۔ اس کے پاس کریوائی روگ میں لوہے کی کانیں ہیں ۔ دریائے ڈانٹیس کے طاس میں اعلیٰ قسم کا کوئلہ ہے اور نکوپول کے قریب تمام دنیا سے بڑھ کر مینگنیز (ملکے بھورے رنگ کی ایک دھات جو شیشہ بنانے میں کام آتی ہے ۔) کی تہیں ہیں ۔ یوکرین میں کیف ، خرکاف نیپرو پیٹروسک اور سٹالینو جیسے بڑے شہر اہم صنعتی مرکز ہیں ۔ یوکرین کے
۴۸ صنعتی اور دوسرے کارخانے قریباً ہر چیز مثلاً فولاد ، مرکب دھاتیں اور مشینی اوزار ، موٹر گاڑیاں ، دُخانی گاڑیاں ، بجلی کا سامان ، کیمیاوی سفوف اور سِلے سِلائے ملبوسات تیار کرتے ہیں ۔ ۳۴ ۔ ۱۹۳۰ء میں روسیوں نے امریکیوں کی امداد سے دریائے نیپر کے کنارے واقع زیپوروزہی کے مقام پر ایک بہت بڑا بند اور برقابی توانائی کا کارخانہ بنایا ۔ جس سے ایلومینیم ، فولاد اور گردونواح کے وسیع علاقے کے دوسرے کارخانوں کو برقی قوت بہم پہنچتی ہے ۔ سائبیریا اور یورال کی نئی صنعتوں کے برعکس یوکرین کی صنعتیں ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے مدتوں پہلے وجود میں آچکی تھیں ۔ لیکن سوویٹ حکومت نے انہیں بڑا وسیع کیا ہے ۔ یوں مشرقی روس کی نسبت یوکرین زیادہ ترقی یافتہ ہے ۔ اس میں ریل کی سڑکوں کا بھی بہت بڑا جال بچھا ہے اور اچھی بندرگاہیں بھی بکثرت ہیں ۔ کیف جیسے گیارہ لاکھ سے زیادہ آبادی

کا فخر ہے دلکش اور حسین مناظر کا شہر ہے۔ دریائے نیپر کے مغربی ساحل پر واقع پہاڑیوں کی بلندیوں سے یہ شہر اس بہتے ہوئے دریا اور پار کے لامتناہی میدانوں، بل کھاتے ہوئے کھیتوں اور مرغزاروں کو دیکھنے میں محو معلوم ہوتا ہے۔ نیپر دریائے والگا کے برابر تو نہیں پھر بھی کافی بڑا اور قابلِ جہازرانی دریا ہے اور اس نے کی گزشتہ زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

کیف کے نواح میں یوکرین کا شمالی رقبہ روس کا قدیم ترین حصّہ ہے۔ موجودہ سوویٹ یونین کے بیشتر علاقوں نیز ماسکو کی نسبت روسیوں نے اسے بہت پہلے آباد کیا تھا۔ کیف ماسکو سے دو سو اسّی سال پہلے کا ہے۔ سوویٹ دارالحکومت اپنی تاریخ کا آغاز ۱۱۴۷ء سے کرتا ہے جب کہ کیف وثوق کے ساتھ ۸۶۰ء بلکہ غالباً اس سے بھی پہلے وجود میں آیا۔

اسی وجہ سے یہ تمام روسی شہروں کی ماں کا درجہ رکھتا ہے۔ اب تک کیف میں ایسے مقامات موجود ہیں جو اس کی قدامت کا پتا دیتے ہیں. مثلاً بے شمار گرجوں میں سے ایک سینٹ سوفیہ کا کتھیڈرل ہے جس کے دس سنہری گنبد ہیں۔ یہ پہلی بار شہزادہ یارو سلاف کے عہدِ حکومت میں ۱۰۳۷ء میں تعمیر ہوا۔ پھر بیرونی حملوں اور جنگوں میں اس کے کئی حصّے منہدم ہوگئے اور از سرِ نو بنائے گئے۔ لیکن قدیم کتھیڈرل کا بیشتر حصہ اپنی اصلی حالت میں بلا ردّو بدل موجود ہے۔ اس کے اندر دیواروں پر شاندار اور بیش بہا منبّت کاری اور روحانی پیشواؤں کی تصاویر نظر آتی ہیں جنہیں شہزادہ یارو سلاف کے بازنطین سے بلائے ہوئے فن کاروں نے بنایا تھا۔ کیف کے مضافات میں مشہور لادوا راہب خانے کی بعض عمارات کی بنیادیں بھی ایسی ہی قدیم ہیں۔ اس راہب خانے کی شہرت کا یہ سبب بھی ہے کہ اس کی زیرِ زمین گہرائیوں میں بھول بھلیّاں کی وضع کا وسیع قبرستان ان غاروں کے

ساتھ ملحق ہے جن کے نیچے دریائے دنیپر بہ رہا ہے۔ جب روسی تاریخ کی صبح طلوع ہوئی تو دنیا سے کنارہ کش پارسا راہب یہاں تنہائی میں عبادت کی زندگی گزارتے تھے۔ ان کے مدفن کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ انہی زیر زمین قبرستانوں میں اہلِ کیف نے حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ اور آتش زدگی کے وقت پناہ لی۔ قدیم کیف اور اس کے نواحی یوکرینی علاقے کا مقابلہ اور موازنہ امریکی مشرقی ریاستوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا آغاز بحر اوقیانوس کی چند ساحلی آبادیوں سے ہوا تھا۔ پھر اس کے بنیادی آبادکار رفتہ رفتہ شمال کی جانب ورجینیا، میساچوسٹس اور جزیرہ روڈ اور مغرب میں بالآخر بحرِالکاہل کے کنارے تک پہنچ گئے۔ اسی طرح رُوسی، جن کی تاریخ کیف سے شروع ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ مشرق اور مغرب کو پھیل گئے تاآنکہ انھوں نے وہ تمام علاقہ زیرِنگیں کر لیا جس میں وہ اب بودوباش رکھتے ہیں۔ اس بناء پر یہ کہنا صحیح ہے کہ روس کیف میں پیدا ہوا۔

لینن گراڈ کے علاقے کی طرح تمام یوکرینیا بھی دوسری عالمی جنگ میں مصائب کا شکار ہوا نازی فوجیں ۱۹۴۱ء میں اس پر حملہ آور ہوئیں اور کہیں ۱۹۴۴ء کے شروع میں سرخ فوج انھیں نکال پھینکنے میں کامیاب ہوئیں مگر دشمن کے عساکر یوکرین کو تباہ و برباد چھوڑ کر گئے۔ اس کے بعد شہر تو بالکل ویران ہو گئے۔ کیف کی بہترین عمارات مذبح نظر آنے لگیں۔ ہال سینٹ سوفیہ کے کتھیڈرل کو ضرب نہ پہنچی۔ ملک کے بڑے بڑے صنعتی کارخانے بُری طرح توڑے پھوڑے گئے یا کاملاً مسمار کر دیے گئے۔ دریائے نیپر کا زیپوروزہی بند کا بہت سا حصہ اڑا دیا گیا۔ دریائے ڈانیٹس کے طاس میں واقع کوئلہ کی کانیں پانی
۴۸ سے بھر دی گئیں اور اکثر مقامات پر گیہوں کے لہلہاتے کھیت اور مشہور یوکرینی باغات پر گولہ باری سے تباہی پھیلا دی۔ بقیہ ٹینکوں اور آتی جاتی فوجوں کے پاؤں تلے روندے گئے۔

مگر روسیوں نے جو کچھ ہو چکا اس پر رونے دھونے میں وقت ضائع نہ کیا۔ بلکہ مضیٰ ما مضیٰ پر کاربند ہوتے ہوئے جونہی توپوں کا شور و شغب بند ہوا تعمیرِ نو میں لگ گئے۔ یہ ان

کے لیے سخت صبر آزما ء اور مشقت کا زمانہ تھا مگر انھوں نے جو کچھ برباد اور ویران ہوا ، اسے دلیرانہ ہمّت کے ساتھ پھر بنایا بلکہ بہتر اضافہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوکرین کی صنعتی پیداوار ماقبل جنگ سے بدرجہا بڑھ گئی۔

کیف سے بذریعہ ریل آپ جنوبی یوکرین کے میدانوں کو طے کر کے اُڈیسہ پہنچئے۔ یہ شہر چھیاسٹھ لاکھ کی آبادی کا ہے اور بحیرۂ اسود کے کنارے ملک کی ممتاز بندرگاہ ہے۔ اس کی بہترین منصوبہ کے مطابق بنائی ہوئی شاہراہیں، چوک اور چمن زار ساحل کی سطح مرتفع سے بندرگاہ کے پُر رونق رقبے اور پار کی خلیج پر نظریں جماتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ماضی میں اُڈیسہ بڑے پیمانے پر برآمد اور درآمد تجارت کرتا تھا۔ اس میں بلقان اور بحیرۂ روم کا قرب محسوس ہوتا ہے۔ اس کی سڑکوں پر رواں دواں ہجوم میں یونانیوں، رومانیوں اور قفقازیوں کا بہت بڑا عنصر ملا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اڈیسہ سے آپ جہاز پر سوار ہوں جو رات بھر میں آپ کو کریمیا کی بندرگاہ یالٹا پہنچا دے گا۔ یوکرین کے جنوب میں واقع چھوٹا سا جزیرہ نمائے کریمیا، دور تک بحیرۂ اسود کے اندر چلا گیا ہے۔ مشرق کی جانب یہ بحیرۂ ایزوف کے ساتھ ملحق ہے۔ یہ پوری سوویٹ یونین کی پسندیدہ تفریح گاہ ہے۔ آپ چاہیں تو اسے روس کا فلوریڈا کہہ لیں۔ یہ تشبیہ یالٹا کے نظّارہ پرور بند، شاہراہیں اور باغات دیکھتے ہی آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔

کریمیا کے جنوبی ساحل کے قریب کوہستان یائلا کا سلسلہ ہے بہت بلند تو نہیں مگر یہ پہاڑ اس ساحل کی شمالی ہواؤں سے حفاظت کو کافی ہیں۔ اس لیے یہاں کی آب و ہوا گرم ہے۔ موسمِ گرما کی تمازت کو بحری ہوائیں اعتدال بخش کر خوش گوار بناتی ہیں۔ جاڑوں میں برف باری کبھی کبھار ہوتی ہے اور وہ بھی فوراً پگھل جاتی ہے۔ ان پہاڑوں کی جنوبی ڈھلانوں پر اور پورے سمندری ساحل کے ساتھ ساتھ

نباتات بہ کثرت ہے۔ یالٹا کی تمام نواحی میں سرو، کینر، میگنولیا، موسا، انار، زیتون ۴۹ انجیر اور دوسرے جنوبی آب و ہوا کے شجر و ثمر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں کے دامن انگور کی بیلوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اس لیے کریمیا انواع و اقسام کی شراب کے لیے مشہور ہے اور تمباکو کی کاشت بھی بہتات سے ہے۔ باغوں میں رنگ برنگ کے پھولوں کی فراوانی بہار دکھا رہی ہے۔ کہیں کہیں ہریاول کے اس طوفان میں ازمنۂ وسطیٰ کی جاذبِ منظر باقیات قلعے، یونانی عبادت گاہیں، اور شہروں کے کھنڈر مرصع کاری کا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے اوائل حصے میں کریمیا بارونق اور شاداب یونانی آبادیوں سے معمور تھا۔ ارضی نارنگی اور سمندر سے اٹھتی ہوئی سرخی مائل سیاہ اور کہیں سفیدی مائل زرد عمودی چٹانیں کریمیا کے حسنِ نظارہ کی تکمیل کرتی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے نام کے برعکس بحیرۂ اسود گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ صرف طوفان کے دنوں میں یہ سیاہی مائل بھورا یا بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔

سوویٹ یونین کی تمام اطراف سے ہزاروں اشخاص تعطیلات گزارنے کے لیے کریمیا میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں وہ اس کے ساحلوں پر دھوپ سینکتے، کھیلتے، پیراکی کرتے اور کوہستان یائلا میں طویل پیدل سفر کرتے ہیں۔

ساحل کے ساتھ ساتھ شاد و آباد بہت سے چھوٹے چھوٹے شہر بالخصوص یالٹا، الوپکا اور گرزف گرمائی تفریح گاہیں ہیں۔ ماضی میں یہاں زار اور شاہی خاندان کے افراد کے گرمائی محل تھے۔ انقلاب کے بعد سے ان محلات اور کئی ایک دوسری نئی عمارات کو خصوصاً سوویٹ معاشرے کے اعلیٰ طبقہ کے لیے ہوٹلوں اور راحت گاہوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سرکاری حکام، سائنسدان، انجینئر، مصنف، ڈاکٹر اور کچھ اچھی تنخواہیں پانے والے کارکن بھی اپنی تعطیلات یہاں گزار سکتے ہیں۔ کریمیا کے جنوبی کونے میں سیبسٹاپول کا بڑا قلعہ ہے جو بحیرۂ اسود کے بیڑے کا بڑا مرکز ہے۔ پہاڑیوں کی آغوش میں چھپی ہوئی

ایک عمیق خلیج جو جنگی جہازوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ ہے اس اڈّے کا مثالی مستقر ہے۔

دوسری عالمی جنگ سے قبل کریمیا میں تاتاریوں کی بڑی تعداد نظر آتی تھی۔ تاتاری نسل کا ترکوں سے قریبی تعلق ہے اور ان کی زبان بھی ترکی زبان ہی کی ایک شاخ ہے۔ وہ اس وقت تک اپنا قومی لباس پہنتے ہیں، یعنی سر پر مڑھی ہوئی چھوٹی چھوٹی کام دار ٹوپیاں اور لمبے دامن والے کوٹ۔ وہ اپنے آبائی مذہب اسلام کے انتہائی شیدا ہیں۔ آج بھی ان کی خوبصورت عبادت گاہیں یعنی مسجدیں وہاں نظر آتی ہیں۔ ۵۰

۱۷۸۳ء تک کریمیا روس کی ملکیت نہ تھا۔ یہ ایک نیم آزاد تاتاری ریاست تھی جس پر اس کا اپنا خان یا بادشاہ حکمراں تھا۔ نیم آزاد اس لیے کہا کہ خوانین کریمیا نے دارالخلافہ قسطنطنیہ کے زبردست ترکی سلاطین کا اقتدار کسی قدر تسلیم کر لیا تھا۔ جنگوں اور ہنگامی ضروریات میں یہ سلاطین اکثر خوانین کریمیا کی امداد کرتے تھے۔

سولہویں اور سترہویں صدیوں میں کریمیا کے تاتاری جنگجو قوم تھے اور ان کی مملکت بڑی طاقتور تھی۔ اصلی کریمیا کے علاوہ وہ یوکرین کے پورے جنوبی حصّے پر بھی جہاں آج اڈیسیہ اور نکولیف کے شہر آباد ہیں حاوی تھے۔ مزید برآں کریمیا کے تاتاری بسا اوقات اپنے ترکی حلیفوں کی امداد سے ماسکو کی زاری مملکت پر یورشیں کرتے رہتے تھے۔ سرتاپا مسلّح تاتاری ترک سواروں کے لشکر جنوبی اِسٹیپی میدان سے ماسکو میں داخل ہو کر چیختے چنگھاڑتے ہوئے روسی شہروں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑتے، انہیں جلا دیتے، تمام علاقے کو تاراج کرتے اور قتلِ عام کے بعد جتنی تعداد میں ہو سکتا لوگوں کو قیدی بنا کر لے جاتے تھے۔ پھر روسی قیدیوں کو قسطنطنیہ بھیج دیا جاتا تھا جو اس وقت غلاموں کی بڑی منڈی تھا۔ وہاں انھیں صاحبِ ثروت ترکوں، مصریوں اور ایرانیوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا۔ ریڈیو اور تار برقی کے فقدان کے اس زمانے میں تاتاریوں کی زد میں آیا ہوا کوئی روسی شہر دور دراز شمال میں واقع دوسرے شہروں کو حملہ آوروں کی آمد سے فوراً مطلع نہ کر سکتا تھا۔ گھڑ سوار

حملہ آور اکثر اپنے حملے کی افواہوں کی نسبت زیادہ تیز رفتار ثابت ہوتے تھے۔ اس سبک روی کی بدولت وہ مسکوویا کے قلب کی گہرائیوں میں جا پہنچتے یہاں تک کہ ۱۷۵۱ء میں یہ نوبت بھی آگئی کہ انھوں نے خود ماسکو کا شہر تاراج کیا اور اسے جلا کر راکھ کر ڈالا۔

صرف ملکہ "کیتھرائن عظمیٰ" کے عہد میں ہی روس حتمی طور پر "وبائے کریمیا" کو نیست و نابود کرنے کی قوت حاصل کر سکا۔ ہوشیار اور بہادر سپہ سالاروں کی کمان میں کیتھرائن کی فوجوں نے ایک مہیب جنگ میں پورے ترکی بحریے کا قلع و قمع کر دیا اور خشکی پر بھی ترکوں کو لرزہ خیز شکستیں دیں۔ ۵۱

قسطنطنیہ کا سلطان کریمیا پر اقتدار کا دعویٰ چھوڑنے پر مجبور ہوگیا اور ترکی امداد سے محروم ہونے پر خان نے بھی ۱۷۷۲ء میں ملکہ کیتھرائن کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کے دس سال بعد کریمیا کھلم کھلا مملکتِ روس میں شامل کر لیا گیا اور روس کا حصّہ بن گیا۔

ڈیڑھ سو سال تک کریمیا کے تاتاری روسیوں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو کر انگوروں کے خوش حال باغبانوں اور گلّہ بانوں کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد روس کے نئے اشتراکی حکمرانوں نے تمام مذاہب کے خلاف مہم شروع کی۔ اس سے شیدائے دین و ایمان کریمیا کے تاتاری بے حد مشتعل ہوئے اور بعض ۴۴-۱۹۴۱ء میں جرمن حملہ آوروں کے ساتھ تعاون پر مجبور ہو گئے۔ جنگ کے اختتام پر سوویٹ حکومت نے تاتاریوں پر بڑے ظلم و ستم توڑے۔ کریمیا کی تین لاکھ پچاس ہزار کی تمام تر تاتاری آبادی میں سے بہت سوں کو گولی مار دی گئی اور بقیہ سائبیریا میں جلاوطن کر دیے گئے کچھ معلوم نہیں کہ وہاں ان کا کیا انجام ہوا۔ بہرحال بہت کم تاتاری اب اپنے جدّی وطن کریمیا میں رہ گئے ہیں۔

یالٹا سے اور مشرق کی جانب بحیرۂ اسود کی ایک پٹی کے پار قفقاز کا علاقہ ہے جو بحیرۂ اسود اور بحیرۂ خزر کے مابین دبا ہوا اپنے تیل، اپنے پہاڑوں، اپنے غیر معمولی حسن اور

اپنے حیرت انگیز باشندوں کے لیے مشہور ہے ۔ آپ کی فرودگاہ نووروسیک اس کی اہم بندرگاہ ہے ۔ جہاز پر سے ہی اس کے بھاری بھرکم اناج برداروں کی طرف توجہ خودبخود مبذول ہوتی ہے ۔ اس سرزمین کا پورا جائزہ لینا ہو تو ریل کا سفر اختیار کرنا چاہیے لیکن اس سے بہتر یہ ہوگا کہ نووروسیک سے کار کرایہ پر لے کر جنوب مشرقی جانب سے ہوتے ہوئے علاقے کے مرکزی حصے میں داخل ہو جائیے ۔

پہلے تو دریائے کوبان کے دلدلی ساحل کے ساتھ ساتھ ہموار زرعی علاقے سے گزرنا ہوتا ہے ۔ موسم گرما یہاں اتنا شدید ہے کہ گیہوں اور اناج کے علاوہ کپاس اور چاول بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ دھوپ سے جھلسے ہوئے چہروں اور بیٹھی ہوئی آوازوں والے لوگ
جو قفقاز کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں یوکرینی نسل سے ہیں اور کیوبن قزاق (کاسک) ۵۲
کہلاتے ہیں ۔

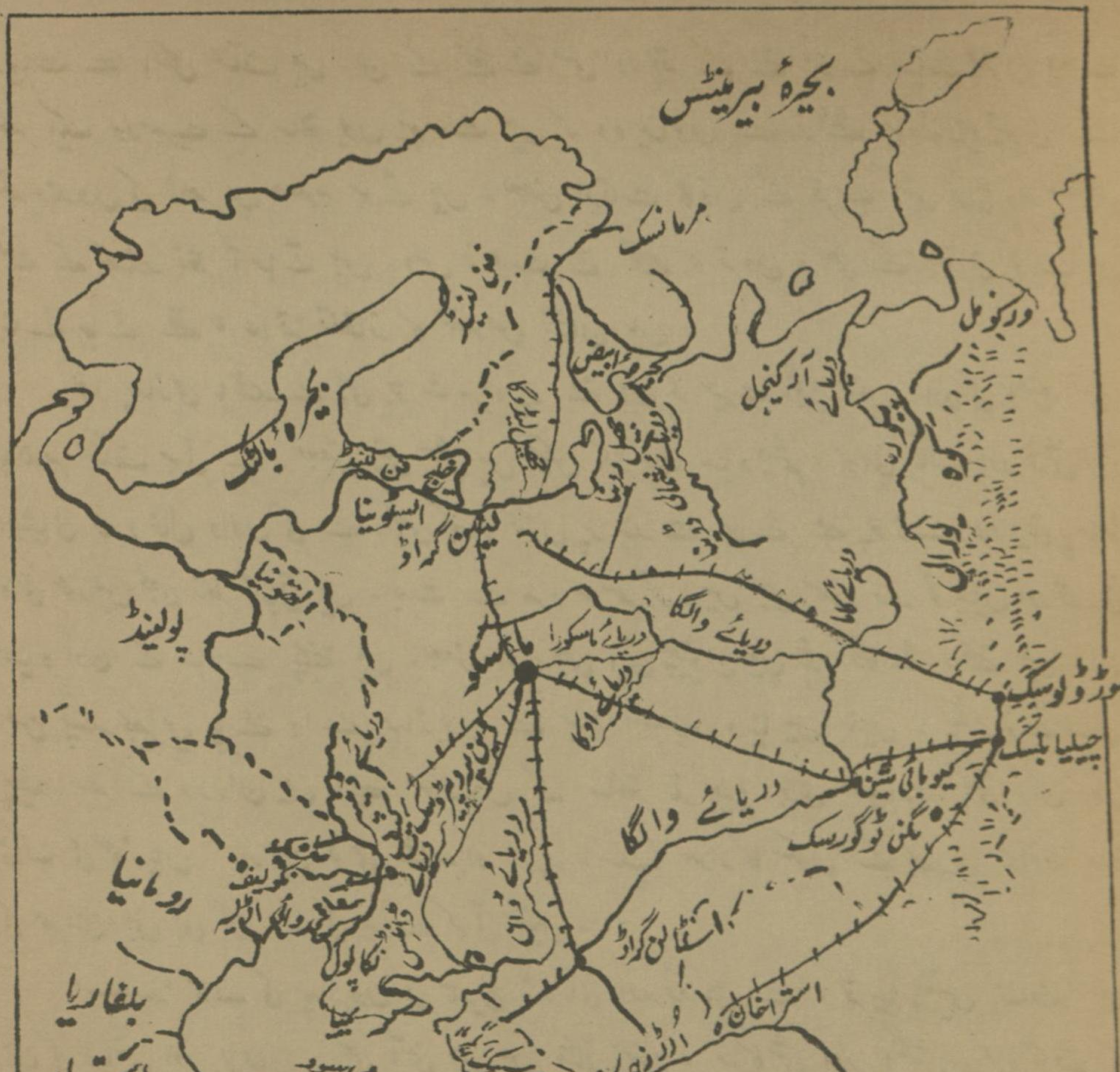
کوئی دو سو پچاس میل سفر طے کرنے کے بعد سطح بلند ہونے لگتی ہے ۔ کھیتوں کی جگہ اب زیادہ تر جنگلی گیاہستان کے گیاہ زار نظر آتے ہیں ۔ ہوا چلتی ہے تو یہ گھاس دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتی ہے ۔ بعض اوقات عین دن کی گرم ساعتوں میں جنوب کی سمت سے آنے والی ہوا بے حد سرد ہو جاتی ہے ۔ پھر آپ کو یکایک دور افق پر، نیلگوں آسمان سے مختلف رنگ کی دندانے دار سفید لکیر نظر آئے گی ۔ یہ ایک بے ڈھب بدذوقی سے انتخاب کیے ہوئے موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی ہے ۔ حقیقت میں یہ کوہستان قاف کی برف پوش چوٹیوں کا سلسلہ ہے ۔

کوہستانِ قاف یورپ کے سب پہاڑوں سے بدرجہا بلند سلسلہ ہے ۔ اس کی البرز یا کازبک کی مہیب اور مرعوب کن دو سر والی چوٹیاں سوئٹزرلینڈ کے کوہ الپس کی بلند ترین چوٹیوں سے تین ہزار فٹ اونچی ہیں ۔ کوہستانِ قاف سات سو پچاس میل لمبا اور بینتیس میل سے ایک سو تیس میل تک چوڑا ہے ۔ یہ شمال مغرب سے جنوب

مشرق تک پھیلا ہوا ہے اور پورے علاقے کو کبھی مستطیل کے وتر کی طرح کاٹتا چلا گیا
ہے۔ شمال میں واقع کوہستان یورال کی طرح اسے یورپ اور ایشیا کے مابین حدِ فاصل
سمجھا جاتا ہے۔

کوہستان قاف اتنا دشوار گزار ہے کہ اس میں سے کوئی ریل کی سڑک نہیں گزرتی
یہ سڑکیں بحیرۂ اسود اور بحیرۂ خزر کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ جاکر جہاں پہاڑوں کی
ڈھلانیں ہیں حلقہ بناتی ہیں۔ البتہ بڑے سلسلے میں چند ایک گھاٹیاں ہیں جنہیں گھوڑے پر
یا موٹر گاڑی سے پار کیا جا سکتا ہے۔ موٹر گاڑی کا بہترین راستہ جارجین فوجی شاہراہ
ہے جو سلسلہ کوہ کے شمالی دامن میں واقع اچھے بڑے صنعتی شہر اور ریلوں کے مرکز
اُرزہونی کِدز سے شروع ہوتی ہے۔ اس نقطے سے آگے یہ سڑک دریائے تیریک کی
وادی سے گزر کر پیچ و خم کھاتی ہوئی بلندیوں پر پہنچتی ہے۔ سلسلے کی ڈھلانوں کے زیریں
حصے گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں اور ان میں ریچھ بھیڑیے اور بن بلاؤ بھرے
پڑے ہیں۔ لیکن سطح مُرتفع پر جنگل ناپید ہو جاتے ہیں۔ صرف گھاس اور کوہ الپس
کی سی جھاڑیاں اُگتی ہیں۔ یہاں ہوا صاف، پاکیزہ اور بہت سرد ہے۔ کہیں کہیں
۵۳ سایہ دار خطے کی شکنوں میں وسط جولائی تک بھی برف پڑی رہتی ہے۔ اور ان سرسبز
ڈھلانوں سے جہاں درختوں کا نام نہیں مہیب چوٹیوں کی بے قاعدہ قطاریں اٹھتی ہیں
ان چٹانوں کی طرح سخت اور پتھریلی ڈھلانوں پر ہمیشہ برفانی چادر پڑی رہتی ہے سوائے
ان حصّوں کے جہاں چٹانیں اتنی عمودی ہیں کہ برف ان پر ٹھہر نہیں سکتی۔ برف کے عظیم
تودے جن کی چوڑائی بعض اوقات دو میل تک ہوتی ہے ان چوٹیوں پر سے ڈھلک آتے
ہیں۔ یہ حُسنِ فطرت کا ایسا ولولہ انگیز منظر پیش کرتے ہیں کہ قلم کو یارائے بیان نہیں۔

کچھ فاصلے پر آپ کو قفقاز کے پہاڑی باشندوں کے دیہات چٹانوں اور وادیوں
کے درمیان ایسے دکھائی دیں گے گویا پرندوں کے گھونسلے ہیں۔ وہ روسی کسانوں کے


بحیرۂ بیرینٹس
مرمانسک
فن لینڈ
بحیرۂ ابیض
آرکینجل
بحیرۂ بالٹک
خلیج فن لینڈ
ایسٹونیا
لینن گراڈ
پولینڈ
ماسکو
دریائے ماسکوا
دریائے والگا
سورڈلوسک
چیلیابنسک
کیوبائی شیف
دریائے والگا
استالن گراڈ
استراخان
رومانیا
بلغاریا
استنبول
بحیرۂ اسود
ترکی
ایران
یورپی رُوس

دیہات سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کے ننھّے مُنّے مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے سپاٹ چھتوں والے گھر ایک دوسرے کے ساتھ یوں پیوست ہیں کہ وہ چٹانوں سے تراشے ہوئے چیونٹیوں کے گھروندوں کی ڈھیریاں معلوم ہوتے ہیں۔ بعض اوقات گاؤں کے قریب کسی بُرج دار سنگین قلعے کے کھنڈر نظر آجاتے ہیں۔ اس نوعیت کے قلعے جو قرونِ وسطیٰ کے مغربی یورپ میں بنائے جاتے تھے، علاقۂ قفقاز کا مخصوص نشان ہیں۔

۵۳ خود پہاڑی باشندے بھی جو شاہراہ پر ملتے ہیں کم حیرت انگیز نہیں۔ ان کی وضع قطع بالعموم مختلف ہوتی ہے۔ بعض نیلی چشم ہیں لیکن اکثریت سیاہ چشم، محرابی ناک اور خوش تراش ایشیائی خدوخال والوں کی ہے۔ کبھی کبھار ٹخنوں پر بندھے ہوئے لمبے پوڑے روایتی پاجاموں والی عورتیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ بہت سے مرد موسم گرما میں بھی سمور دار ٹوپیاں اور قدرتی سیاہ اُون کے لبادے پہنتے ہیں۔ بعض اب بھی اپنی پیٹیوں میں خنجر لگائے رکھتے ہیں۔ ان امن پسند بھیڑیں پالنے والے پہاڑیوں سے بہتر شہسوار دنیا میں نہیں۔ لیکن نوتے سال پیشتر سفر کے دوران میں ایسے سواروں کے ساتھ مڈبھیڑ بڑی مصیبت تھی۔ ان دنوں ڈاک کی گاڑیاں "جارجین فوجی شاہراہ" پر اسپ سوار کاسکوں کے بھاری محافظ دستے کی ہمراہی میں ہی گزرنے کی جرأت کرتی تھیں۔

سلسلۂ قاف کی پہاڑیوں کی تاریخ ڈرامائی اور رُومانی ہے۔ قریباً پینتیس مختلف نسلیں جن کی زبانیں اور بولیاں بھی اتنی ہی ہیں مثلاً چیچین، سرکاشی اور انگش، کوہ قاف کے بڑے سلسلے اور اس کی شمالی ڈھلانوں پر آباد ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ ان

۵۴ میں کا ہر قبیلہ پہاڑوں کے پورے پورے حصّے پر چھایا ہوا ہے۔ بعض اتنی مختصر ہیں کہ ایک یا دو وادیوں میں ہی آباد ہیں۔ ہر دو تین میل کے فاصلے پر آباد گروہ کی زبان مختلف ہے۔ یہ لوگ قریباً تمام کے تمام مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں۔

ان پہاڑی لوگوں کی تاریخ کا بڑا حصّہ غیر معلوم ہے مگر ان کی مختلف نسلوں کے فرق کا

سبب یہ ہے کہ پہلی دوسری صدی کے آغاز میں بہت سے لوگ ایشیا سے منتقل ہوکر حالیہ یورپی روس اور اس سے بھی آگے مغرب کی طرف آئے۔ راستے میں ان کا گزر شمالی قفقاز کے اسٹیپی میدان سے ہوا اور دورانِ سفر میں بعض گروہ دشمنوں کے حملوں اور دوسرے مصائب کی بدولت اپنے قبیلوں سے کٹ کر قفقاز کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ اگر یہ واقعات انھیں میدانوں میں پیش آئے ہوتے تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل جاتے اور وقت گزرنے پر ایک نسل بن جاتے۔ مگر صدیوں تک دشوار گزار گھاٹیوں میں بودوباش رکھنے سے وہ عملاً باقی دنیا سے علیحدہ ہوگئے اور اس طرح انھوں نے نہ صرف اپنی زبانوں کو محفوظ رکھا بلکہ اپنے معاشرے اور طریقِ زندگی کو بھی جو آٹھویں نویں صدی کا نمونہ ہیں۔ قائم رکھا۔

آج سے قریباً نوّے سال پہلے ان پہاڑی قبیلوں نے اپنے ہی قومی سرداروں یا شہزادوں کی سربراہی میں ایک بڑی تعداد آزاد ریاستوں کی قائم کی جن میں ایشیائی قرونِ وسطیٰ کا رنگ تھا۔ قفقاز کے تمام باشندوں کی طرح جوشیلے ہونے سے ان پہاڑی لوگوں میں ذاتی وقار کا احساس بہت تیز تھا۔ بے عزتی کا بدلہ خنجر سے لیا جاتا اور اس کا نتیجہ لامتناہی خون خرابوں کی صورت میں نکلتا تھا۔ بعض اوقات مخالف خاندانوں کے افراد میں قتل اور جوابی قتل کا سلسلہ پوری صدی تک چلتا رہتا تھا۔ امریکہ میں ایسے ہی قصے کینٹکی کی عقبی پہاڑیوں اور جنوبی ریاستوں کے دوسرے دور افتادہ پہاڑی حصوں میں چلتے رہے۔ پہاڑی باشندے کسی دوست کو اس کی ضرورت کے وقت ہر چیز یعنی بے پایاں مہمان نوازی، گھوڑا یہاں تک کہ جانِ عزیز دے دینا بھی اپنا مقدس فریضہ سمجھتا تھا۔ پہاڑوں میں پُرامن طریقِ زندگی کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا اور صرف خواتین کے لیے مخصوص اور موزوں
تھا۔ بے باک جرأت، سپاہ گری اور موت سے قطعی بے پروائی مردانہ اوصاف خیال ۵۵
کیے جاتے تھے دشمن کو بالخصوص کسی عیسائی کو میدانِ جنگ میں قتل کر دینا، اس کا گھوڑا

زین اور دوسرا سامان لوٹ لینا اور اس کی بیوی کو ترکوں کی کنیز بنا کر بیچ دینا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔

یہ پہاڑی لوگ ہمیشہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے۔ مزید برآں اپنے دیہات کی بلندیوں سے اتر کر وہ روسی کاسکوں اور ان کے ہمسایوں پر حملے کرتے رہتے۔ اس لیے روسی زار انہیں مغلوب کرنے پر تُل گئے۔ مگر یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ ہر گاؤں اپنے محلِ وقوع کی بدولت ایک قلعہ تھا اور مذہبی جوش کے زیرِ اثر یہ پہاڑی باشندے قابلِ قدر شجاعت اور مہارت سے جنگ آزما ہوتے تھے۔ پھر سلاطینِ ترکیہ انھیں اسلحہ بہم پہنچاتے تھے اس لیے بڑی مدت کے بعد کہیں ۱۸۲۴ء میں کوہستانی قبیلوں کو مغلوب کیا گیا۔

اہلِ روس ان پہاڑیوں کے مذہب، رسومات اور روایات کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مفتوح ہونے کے بعد بہت سے پہاڑی جن کے آباو اجداد روسیوں کے ساتھ آخر دم تک برسرِ پیکار رہے، زار کی فوج میں بڑی وفاداری سے خدمات بجالائے اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس بناء پر پہاڑی سردار روسی امراء بنائے گئے۔

پھر ۱۹۱۷ء کا انقلاب آیا جس کے بعد بعض پہاڑی قبائل روس کے نئے اشتراکی حکمرانوں کے اس لیے ہم نوا نہ ہو سکے کہ وہ ان کے مذہب اور عہدِ وسطیٰ کی روایات کا پاس نہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے بعض قبیلوں از قسم چیچن اور انگش کا ایسے ہی ظلم و تشدد سے خاتمہ کیا جس طرح کریمیا کے تاتاروں کا کیا تھا۔

آپ کی موٹر کار، بلندیوں پر چڑھتی جاتی ہے۔ ایک مقام پر شاہراہ ایسی تنگ گھاٹی سے گزرتی ہے جو چٹان کی مہیب دیوار میں ایک شگاف سی معلوم ہوتی ہے۔ بس اتنی ہی گنجائش ہے کہ دو موٹریں پہلو بہ پہلو گزر جائیں۔ نیچے دریائے ٹیرک کا فقط تین گز چوڑا پاٹ ہے۔ اس طرح دب کر یہ دریا ایک تیز رو نالہ بن جاتا ہے اور نیاگرا آبشار کی طرح شور کرتا ہے۔ سڑک کے دائیں بائیں چٹان کی دیواریں دو میل تک سیدھی اٹھتی

چلی گئی ہیں - سورج کی کرنیں اس تنگ گھاٹی میں کبھی داخل نہیں ہو سکتیں -

مگر بہت جلد یہ شاہراہ انتہائی بلندی پر پہنچ جاتی ہے اور پھر یکایک جنوبی قفقاز ۵۶
کے اوپر کا لامتناہی منظر سامنے آجاتا ہے ۔ جو بڑے سلسلۂ کوہ کے جنوب میں قفقاز کا ایشیائی حصہ ہے ۔ یہ خاصے بڑے رقبے کا علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے یہیں جنوبی قفقاز کے انتہائی جنوب میں کوہ ارارات واقع ہے جہاں انجیل کے حسبِ صراحت طوفان کے بعد حضرت نوح ؑ کی کشتی ٹھہری تھی -

اب اترائی شروع ہوتی ہے ۔ جو اتنی عمودی نہیں جتنی چڑھائی تھی - پہاڑوں کے اطراف انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں - وادیوں میں کشت زار ، باغات اور بڑے بڑے شاداب دیہات ہیں جنوبی قفقاز کا پورا مغربی نصف باشندوں کی نسبت سے جارجیا کہلاتا ہے تمازتِ آفتاب سے جھلسے ہوئے چہروں والی جارجی خواتین کی لمبی قطار ایک پہاڑی ندی سے پانی کے گھڑے بھر کر کندھوں پر اٹھائے ہوئے گاؤں کو واپس جاتی دکھائی دیتی ہیں اور اپنے رنگین ملبوسات میں حسین منظر پیش کرتی ہیں ۔ کچھ فاصلے پر ایک قلعے کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں -

چند گھنٹے بعد آپ تبلسی یا تفلِس پہنچتے ہیں ۔ جو جارجیا کا دارالحکومت اور تیز رفتار دریائے کُرا کے کنارے پانچ لاکھ آبادی کا شہر ہے - یہاں بجلی گھروں ، خوبصورت تھیٹروں ہوٹلوں ، وسیع سایہ دار شاہراہوں اور عظیم صنعتی مرکزوں کے ساتھ ہی پرانے دیسی، تنگ اور ٹیڑھی گلیوں والے محلے بھی ہیں -

یہاں روسی ، جارجی ، آرمینی ، ایرانی اور تاتاریوں کا ملا جلا ، رنگا رنگ ہجوم ہر وقت گھومتا پھرتا ہے ۔ اس طرح جدید مغربی اور قدیم مشرقی دنیا باہم زندگی بسر کرتی ہے ۔ جنوبی قفقاز کے اکثر شہروں میں اس رنگا رنگی سے واسطہ پڑتا ہے ۔ تفِلس کی دکانوں میں جن میں سے بعض کھلے آسمان ہی کے نیچے ہیں ، ہاتھ کے بنے ہوئے خوبصورت

مشرقی غالیچے بکتے ہیں ۔ پہاڑی دیہات کی طرح یہاں بھی یہ غالیچے اکثر گھروں میں نظر آتے ہیں کیونکہ غالیچے مشرق میں آرائش اور تعیّش کا خاص جزو ہیں ۔

کوہستان قاف سے گزرنے کے بعد آپ ایک نئی آب و ہوا میں پہنچتے ہیں ۔ گرمیوں میں شدید گرمی کے باوجود قفقاز کا شمالی اسٹیپی میدان وسطی یورپ کی سی معتدل آب و ہوا رکھتا ہے ۔ لیکن جنوبی قفقاز جسے شمال میں پہاڑی سلسلے کی پناہ میسّر ہے کریمیا سے کہیں زیادہ جنوبی ملک معلوم ہوتا ہے ۔ بحرۂ اسود کے کنارے واقع باتومی بندرگاہ کے ۵۷ نواح میں جارجیا کا مغربی حصّہ تو واضح طور پر نیم استوائی ہے ۔ تفلس سے بذریعہ ریل اس علاقے کا مختصر سا سفر بہت کچھ مفید رہے گا ۔ گرمیوں میں باتومی کا درجۂ حرارت ۱۱۵ درجے یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے ۔ مزید برآں رطوبت بھی بہت ہے ۔ اس لیے یہ علاقہ قدرت کا حرارت خانہ بن جاتا ہے ۔ یہاں گھنی نباتات کی بے انتہا افراط ہے ۔ باتومی کے سفید برّاق مکان جو پہاڑیوں سے سمندر کی جانب اُترتے نظر آتے ہیں ، گلاب ، کیمیلیا ، مموسا ، میگنولیا اور دیگر انواع واقسام کے فراواں خود رَو پھول زمین کے چپّے چپّے سے ابلتے نظر آتے ہیں ۔ یہاں کھجور اور تاڑ کے درخت بھی ہیں ۔ نارنگی ، لیمو ، چکوترے کے باغات اطرافِ شہر میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ روس کو اسی علاقہ سے گھروں میں بوئی ہوئی چائے کی پیداوار ملتی ہے مگر پورے جنوبی قفقاز کی یہ کیفیت نہیں ۔ بعض علاقوں میں بالخصوص آرمینیا میں جو جارجیا کے جنوب مشرق کی جانب ہے رُطوبت کافی نہیں اور قفقاز کی تمازتِ آفتاب اس سرزمین کو سُکھا کر نیم صحرا بنا دیتی ہے ۔

آرمینوں کی طرح اہلِ جارجیا بھی پہلی صدی ہی سے عیسائی ہیں ۔ ان کی اپنی تہذیب ہے جو قریباً تین ہزار سال کی ہے اور ہماری مغربی تہذیب سے کہیں زیادہ پرانی ہے ۔ جارجیا کے نوخیز شہر تفلس کی بنیاد ۴۳۶ء میں رکھی گئی ۔ یعنی کولمبس کی دریافت امریکہ سے قریباً گیارہ سو سال قبل ۔ کئی صدی تک جارجیوں کی اپنی طاقتور آزاد

حکومت رہی ۔ شاہانِ جارجیا اپنا نسب نامہ بائبل کے داؤد بادشاہ تک پہنچاتے ہیں۔ ان کے درباروں میں لطافت اور تجمّل کی کمی نہ تھی ۔ لیکن یہ عیسائی مملکت چاروں طرف دشمنوں سے گھری ہوئی تھی ۔ شمال میں قفقاز کے پہاڑی متواتر حملے کرتے تھے اور مصیبت یہ کہ جنوب سے شاہانِ ایران و ترکیہ (جنہوں نے مدّتوں سے آرمینیوں کو مطیع کیا ہوا تھا) یکے بعد دیگرے یورشیں کرتے تھے ۔ آٹھویں صدی میں جارجیا ان حملوں سے بے حد ناتواں ہوگیا اور اس میں تابِ مقاومت نہ رہی ۔ واحد عیسائی دوست روسی قوم ہی تھی۔
۵۸ جو اسے بچا سکتی تھی ۔ اس لیے ۱۷۹۸ء میں اس کے آخری بادشاہ جارج سیزدہم نے اپنا تاج و تخت روسی زار کے حوالے کر دیا اور اپنی مملکت روس کا ایک حصہ بنا دی ۔

کریمیا کی طرح قفقاز میں بھی پوری سوویٹ یونین سے ہزارہا لوگ تعطیلات گزارنے آتے ہیں ۔ اس عظیم پہاڑی سلسلے کی شمالی ڈھلانوں پر روس کی دو بہترین ساحلی سیرگاہیں کِسلو واڈسک اور اَیسن ٹیکی واقع ہیں ۔ اور انہی مقامات پر کوہ پیما کوہ قاف کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ۔ باتومی کے شمال میں پہاڑوں کی بلندیوں پر متعدد دل کش تفریح گاہیں ہیں جہاں گرمی اعتدال کی ہے اور نظّارہ خوبصورت اور رُوح پرور ۔

باتومی سے ایک ریل گاڑی جنوبی قفقاز سے گزر کر مشرق کی طرف بحیرۂ خزر کے ساحلی شہر باکو تک لے جاتی ہے ۔ جو قفقاز کا سب سے بڑا شہر ہے ۔ باکو کے نواحی علاقے میں ہر جگہ زمین سے تیل رستا ہے ۔ شہر میں تیل کھینچنے کی مشینوں کا جنگل اُگا ہوا معلوم ہوتا ہے جو تاحدِ نظر پھیلا ہوا ہے ۔ شہر کے اندر تیل صاف کرنے کی دیو پیکر مشینیں ہیں ۔ کنووں کے نل اور برمانے کا سامان بنانے کے کارخانے بھی ہیں ۔ اس کی پُر شور گلیوں میں میلے کچیلے لبادوں والے جن سے گیسولین کی بُو آتی ہے ٹھٹ کے ٹھٹ ایشیائی مزدور بھرے ہوئے ہیں

باکو بحیرۂ خزر کی بہت بڑی بندرگاہ ہے ۔ جہاز اس کا تیل پیپوں میں بھر کر

استراخان اور وہاں سے والگا تک لے جاتے ہیں۔ اس کا بقیہ تیل پائپ لائن کے ذریعے باتومی کی طرف جاتا ہے اور وہاں بحیرۂ اسود کی دوسری روسی بندرگاہوں کو تقسیم کیا جاتا ہے باکو تیل کی دولت سے بے حد مالا مال ہے لیکن کاکیشیا میں اس کے علاوہ اور علاقے بھی ہیں۔ شمال کی جانب ارزھونی کڈزی کے قریب اور ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی تیل کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

جنوبی قفقاز کا پورا مشرقی حصّہ باکو سمیت، آذربائیجان کہلاتا ہے۔ اس کے باشندے تاتاری ہیں جو کریمیا والے تاتاروں کے ہم نسب اور ہم زبان ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قفقاز انسانی نسلوں کا ایک رنگا رنگ لحاف ہے۔

۵۹ صرف معدنی تیل ہی واحد خزانہ نہیں جو قاف کے پہاڑوں اور وادیوں میں ملتا ہے۔ شمالی جارجیا کے مقام چیاتورا پر منگینز کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ آرمینیا کے خشک پہاڑوں میں تانبا، ٹین، نکل اور کرومیم دریافت ہوا ہے اور حال ہی میں وہاں دھات پگھلانے کے کارخانے قائم کیے گئے ہیں۔ تیل کی صنعت اور ریل کی سڑکیں قفقاز میں ستّر سال سے قائم ہیں۔ مگر بہت سی دوسری صنعتی ترقیاں ابھی ہوئی ہیں۔ بعض کا آغاز تو پچھلے بیس سالوں میں ہی ہوا ہے۔ سوویٹ حکومت اس علاقے کی صنعتوں کو فروغ دینے میں اتنی ہی سرگرم ہے جتنی سائبیریا میں تھی۔ اس لیے قفقاز جدید بن رہا ہے۔

مگر آرمینیا اور جارجیا کے دور دراز گڈریوں کے دیہات میں ابھی تک ایشیائی قرون وسطیٰ کا رنگ غالب ہے۔ آذربائیجان کی تاتاری عورتیں اب بھی قالینوں میں چار سو سال کے پرانے نمونے بنتی ہیں اور بالخصوص دشوار گزار دیہات میں خون خرابے بدستور ہوتے ہیں۔ مگر پہاڑی نالوں پر پن بجلی کے کارخانے نظر آنے لگے ہیں اور رات کے وقت ان کی روشنیاں ان صنعتی آبادیوں کو منوّر کر دیتی ہیں جہاں محض پندرہ سال پیشتر سنگلاخ ویرانے تھے۔ اسکولوں، صنعتی تعلیم گاہوں اور کارخانوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اس طرح جدید تہذیب

قرونِ وسطیٰ کی مشرقی روح پر غالب آرہی ہے۔ بدقسمتی سے سوویٹ حکومت اکثر بڑی بے دردی سے قفقاز کے لوگوں پر جدید تہذیب ٹھونستی ہے اور ان کے مذہب، روایات اور مخصوص ذہنیت کا احترام نہیں کرتی۔ اس کا نتیجہ خاموش مزاحمت اور بعض اوقات علانیہ مدافعت میں ظاہر ہوتا ہے جس سے ملک کی ترقی بڑھنے کے بجائے رک جاتی ہے۔

اب آپ سوویٹ یونین کے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہیں اور باکو سے بحیرۂ خزر کو پار کرکے مشرقی جانب کراسنووڈسک جاتے ہیں جو روسی مرکزی ایشیا (سابق ترکستان) میں واقع ہے۔ یہ بہت بڑا خطّہ حجم میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک تہائی ہے۔ جنوب میں اس کی حد ایران اور
افغانستان کی مملکتوں اور چین کے ایک حصّے سنکیانگ سے ملتی ہے۔ ۶۰

سطح مرتفع پامیر کے ایک مقام پر کوئی اٹھارہ میل افغانی علاقہ اسے برصغیر پاکستان وبھارت سے جدا کرتا ہے۔ سنکیانگ سے پرے عجائب وغرائب کا مجموعہ تبّت بھی قریب ہی واقع ہے۔ شمال میں وسطیٰ ایشیا مغربی سائبیریا کے میدانوں سے مل جُل جاتا ہے۔

کراسنوواڈسک کسی طرح دلچسپ نہیں۔ یہ ایک غلیظ، گردآلود اور تمازتِ آفتاب سے جھلسی ہوئی محض صنعتی کاروباری بندرگاہ ہے۔ یہاں سے آپ مشرق کی طرف ٹرانس کیسپین ریل کی سڑک پر جو اس کی جنوبی حد کے قریب مرکزی ایشیا کی پوری لمبائی سے گزرتی ہے چلنے والی گاڑی میں سوار ہوں۔

کراسنوواڈسک سے رخصت ہوتے ہی اِس نواح کی تھوڑی بہت ہریاول بھی ختم ہو جائے گی۔ کفِ دست میدان اُجاڑ اور بیابان نظر آئے گا۔ آدھ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ایسا علاقہ آئے گا جہاں چندھیا دینے والی دھوپ اور ریت کے لامتناہی سمندر کے سوا کچھ نہیں۔ خشک گرمی سخت تکلیف دہ ہے۔ بہ ظاہر ہوا ساکن ہے لیکن ریل کا ڈبہ ریت سے بھر دیتی ہے۔ آپ اسے اپنی نشست پر، اپنے ہاتھوں پر اور دانتوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ واضح ہو کہ آپ مرکزی ایشیا کے صحرائے اعظم میں

داخل ہو چکے ہیں۔

آپ اس کے صرف ایک گوشے سے گزر رہے ہیں۔ ایک دن سے بھی کم عرصے میں اس گرد و نواح کا منظر بدل جائے گا۔ اگر ریل کی سڑک بجائے مشرق کے مغرب کو جا رہی ہوتی تو آپ کو تقریباً نو سو میل اجاڑ بیابان کا سفر طے کرنا پڑتا۔ شمالاً جنوباً اس صحرا کا عرض کم و بیش ساڑھے چار سو میل ہے۔ یہاں اس کا نام قراقم یعنی سیاہ بیابان ہے۔ مشرق طرف بڑھ کر یہ قزل قم یا سرخ بیابان کہلاتا ہے۔ اس سے آگے "ہنگر اسٹیپ" یعنی بے آب و دانہ علاقہ ہے۔ مگر ہر صورت ہے وہی صحرا و بیابان۔ سوائے ان حصّوں کے جہاں کسی اکّے دُکّے دریا کی بدولت کہیں کہیں سبز نخلستان ہیں۔ مرکزی ایشیا کا پورا درمیانی منطقہ یعنی پچّن فی صد حصّہ ریگستان ہے۔

باریک زردی مائل سفید ریت سے نرم، بل کھاتی ہوئی ڈھیریوں کی زنجیر بنی پڑی ہے۔ جو غیر متحرک سمندری لہروں کا منظر پیش کرتی ہیں ہر ڈھیری یوں دکھائی دیتی ہے گویا اس پر ہوا موجِ خرامِ ناز سے گل کتر گئی ہے۔ بعض مقامات پر بھورے رنگ کی کرخت جھاڑیاں سخت زمین سے سر نکالتی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر بیشتر حصّے
۶۱ میں یہ بھی صحرا کا لوہا مان کر مغلوب ہو جاتی ہیں۔ خشک ہوا اس قدر شفاف ہے کہ اس میں نگاہ دور دور تک دیکھ سکتی ہے۔ راتوں کو یہاں گیدڑ چلّاتے ہیں۔ سانپ بہت ہیں۔ ایرانی حدود کے ساتھ ساتھ خطرناک زہریلے ناگ ہیں۔ بچھّو اور کراکرت نامی زہریلی مکڑی بھی اس صحرا کے باسیوں میں ہے۔

ریل کے کسی سٹیشن کے قریب آپ کو ترکمان شتربان کی قیادت میں ایک لمبا قافلہ نظر آئے گا۔ گزشتہ صدیوں میں یہ کارواں صحرا میں نقل و حرکت کا واحد ذریعہ تھے۔ اب موٹر گاڑیوں اور ٹرکوں نے شاہراہوں پر ان کی جگہ لے لی ہے۔ پھر بھی یہ بڑا اہم

کردار انجام دے رہے ہیں۔ قبل تاریخ کا پُرسکون اور باوقار سر والا یہ جانور گھوڑے کی نسبت گرمی کا تحمّل کرنے کی زیادہ سکت رکھتا ہے اور زیادہ دیر تک پانی پیے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اونٹ مرکزی ایشیا کا باسی ہے۔ وہاں یہ پالتو اور جنگلی دونو حیثیتوں میں موجود ہے۔ اونٹوں کے کارواں صرف ریت کے مسموم بگولوں سے ڈرتے ہیں کیوں کہ یہ طوفان تمام جان داروں کو مفلوج کر دیتے ہیں۔ انسان ہوں یا حیوان بگولوں کی ریت آنکھوں میں بھر جانے کے خوف سے آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس میں سانس لینا بھی دشوار اور خطرناک ہے۔ صحرا ان جانداروں کی ہڈیوں سے پٹا پڑا ہے جو بادِسموم کی زد میں آتے رہے ہیں۔

مرکزی ایشیا کی سب سے بڑی مصیبت پانی کی قلّت ہے۔ وہ تمام سمندروں سے بہت دور ہے اور بارش نہ ہونے کے برابر ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس وسیع علاقے میں صرف چند چھوٹے چھوٹے دریا ہیں۔ بڑے دریا آمو اور سیر ہیں۔ جنوب کی طرف سے ملک کا بڑا حصّہ طے کر کے یہ دونو بحیرۂ ارال میں گرتے ہیں جو بحیرۂ خزر کی طرح خشکی میں محصور بہت بڑی جھیل ہے۔ چند چھوٹے چھوٹے دریا کہ وہ بھی جنوب سے شمال کو بہتے ہیں کسی سمندر میں نہیں گرتے۔ وہ قراقم اور قزل قم کی ریت میں جذب ہو جاتے ہیں گرمی بحیرۂ ارال اور بحیرۂ خزر کو سکھا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ دونوں میں پانی کی سطح گرتی جا رہی ہے۔ ایک روسی انجینئر نے ایک مرتبہ بڑی حسرت سے کہا "کیا اچھا ہوتا اگر ہم سائبیریا کی کچھ دلدلوں کو یہاں منتقل کر سکتے۔" علاقے کے باشندے جنھوں نے یہ الفاظ سُنے ہم نوائی میں سر ہلانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرکزی ایشیا میں ہمیشہ سے ہی پانی ایک نعمتِ ۶۲
عظمیٰ سمجھا گیا ہے۔ اس کی قدر و قیمت سونے سے بڑھ کر اور بعض اوقات انسانی جان سے بھی زیادہ ہے۔

مگر شمال میں صحرا ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں خوب شاداب مزروعہ زمینیں ہیں جو مغربی

سائبیریا کے کشت زاروں سے مل جاتی ہیں اور جنوب میں بھی ریل گاڑی رتیلے علاقے سے بہت جلد نکال لے جاتی ہے۔

اشخاباد کے قریب پہنچتے ہی زمین کی سطح تدریجاً بلند ہونے لگتی ہے اور ریل گاڑی ایسی سرسبز اور لہلہاتی وادیوں میں داخل ہوتی ہے جو کپاس کی فصلوں، ترکاریوں کے کھیتوں اور پھل دار باغات سے معمور ہیں۔

مرکزی ایشیا کے انتہائی جنوبی حصّے میں سنکیانگ اور افغانستان کی حدود کے ساتھ ساتھ عظیم پہاڑوں کے سلسلے شروع ہوتے ہیں۔ مہیب کوہِ تیان شان اور اس کے قریب ہی سطح مُرتفع پامیر کی برف پوش چوٹیاں کوہ قاف کی چوٹیوں سے بھی اونچی ہیں بعض چوبیس ہزار فٹ تک پہنچتی ہیں ان سلسلوں کے مابین چوڑی اور ہموار گھاٹیوں اور ان کے رفیع وعریض علاقوں کی زمین ریتلی نہیں بلکہ اس کی مٹّی سرخ اور زرخیز نباتاتی کھاد والی ہے۔ سب سے اہم یہ کہ ان علاقوں میں کچھ نہ کچھ پانی ہے۔ پہاڑوں سے نکل کر بہنے والے چھوٹے چھوٹے دریا اس حصّے میں ابھی خشک نہیں ہوئے۔ بے شک یہ دریا ناکافی ہیں اور بے رحم آفتاب علاقے کی بہت سی زمین کو جھُلسا کر بیابان بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ مگر بہت قدیم زمانے سے مرکزی ایشیا کے باشندے بڑے پیچ دار مصنوعی آب پاشی کے منصوبے بنا کر پانی کے ہر قطرے سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ آپ کی گاڑی بار بار کاریزوں کے جال سے گزرتی ہے جو ایک قسم کی گہری تنگ خندقیں ہیں جن کے ذریعے پانی دریاؤں سے کھیتوں کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ مرکزی ایشیا کی پوری تاریخ انہی کاریزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ امن اور اچھی حکومت کے زمانے میں مصنوعی آبپاشی کو بڑی احتیاط سے قائم رکھا گیا اور ترقی دی گئی۔ نتیجے میں ملک خوش حال ہوا۔ جب زمین پانی سے سیراب ہو جاتی ہے تو یہاں ہر چیز بڑی افراط سے اُگتی ہے مگر جنگ وجدل اور بد امنی کے دَور میں کاریزوں کی مرمت نہ ہونے کی بدولت

زمین خشک ہو جاتی اور صحرا تپ کر باشندوں کو فلاکت اور قحط کا شکار بنا دیتا۔

مرکزی ایشیا کے جنوبی گیاہ زاروں میں شکار کثرت سے ہے۔ ریچھ اور جنگلی اونٹ بہ افراط ہیں۔ دریا کے اردگرد دلدلوں میں شیر بھی ہیں۔

مرکزی ایشیا کی اکثر آبادی جنوبی منطقے میں ہی بستی ہے اور یہیں اشخاباد، مرو اور بخارا جیسے بڑے شہر واقع ہیں۔ مگر ابھی آپ ریل گاڑی سے نہ اتریں۔ بہتر ہوگا کہ آپ آگے ذرا اور مشرق کو جا کر زیادہ ممتاز اور قابلِ دید شہر سمرقند میں قیام کریں۔ قفقاز میں تو مسلم مشرق کے کچھ نشانات ہی ملتے ہیں مگر سمرقند کے متعلق تو یہ سمجھیے کہ آپ قدیم اسلامی دنیا کے قلب میں ہیں۔

تفلس کی طرح سمرقند میں بھی جدید عمارات کی قطاروں کے درمیان برقی روشنی سے منور کھلی شاہراہیں ہیں مگر باشندوں کی اکثریت اپنے محلّوں کے پرانے مکانات میں ہی رہتی ہے۔ اس کی پیچدار گلیوں سے گزرتے ہوئے آپ کو ایک منزلہ یا دومنزلہ مکانوں کے دروازے اور دیواریں نظر آئیں گی مگر کھڑکیاں قریباً ناپید ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح یہاں بھی صدیوں تک تعدّدِ ازواج کا رواج رہا ہے اوزبک اور تاجیک خواتین پردے کی پابند تھیں اس لیے ان کے گھروں کے دریچوں کا رُخ گلیوں کی طرف نہ تھا بلکہ وہ اندر صحن میں کھلتے تھے۔ سپاٹ چھتوں پر بنے ہوئے بالاخانے بھی چار دیواری سے اوجھل کر دیتے جاتے تھے تاکہ خواتین اوپر چڑھیں تو دکھائی نہ دیں۔

مگر تجارتی کاروبار کی سڑکوں پر عجیب ہجوم نظر آتا ہے روسی اور مغربی لباس بہت کم لوگوں کا ہے۔ زیادہ تر لوگ چھوٹی چھوٹی کاڑھی ہوئی ٹوپیاں پہنے یا سروں پر رومال باندھے، لمبے لبادے زیب تن کیے، ریش دار ایشیائی چہروں اور ترچھی آنکھوں والے ہیں۔ چوک میں جہاں بازار ہے اقلیدسی شکلوں جیسی جھالروں کے نقش و نگار سے آراستہ ایک سنگین حلقے سے پانی کا فوّارہ اچھلتا ہے۔ قریب ہی ایک چائے خانے یا سرائے

میں آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے اوزبک قالینوں کو خاموشی سے جانچ رہے ہوتے ہیں. مشہور تیکن اور دوسرے اقسام کے قالین اسی قرب وجوار میں تیار ہوتے ہیں .

سمرقند کو اپنی مساجد پر بڑا ناز ہے ۔چند ایک جو شہر کے مرکزی حصے میں ہیں اور ان کے چوکور صحنوں میں منقش ٹائلیں لگی ہوئی ہیں نہایت نفیس اور خوبصورت ہیں. یہ پانچسو پچاس برس سے بھی پہلے کی بنی ہوئی ہیں اور مغل شہنشاہ شاہجہاں کے تعمیر کردہ تاج محل کی یاد تازہ کرتی ہیں - ان کے مرتفع اور مدّور برجوں سے جنہیں منیار کہتے ہیں صدیوں سے مؤذن یا مسلمان مُلّا مومنوں کو نماز کے لیے پکارتے رہے ہیں . بدقسمتی سے یہ مساجد مرمت طلب ہیں اور دھیرے دھیرے خستہ ہوکر گر رہی ہیں .

مرکزی ایشیا کے باشندوں میں ترکمان ، اُزبک ،کاسک اور کرغیز قبیلے تاتاریوں کے قریبی رشتہ دار ہیں اور ترکی زبان بولتے ہیں .تاجیک البتہ ایرانی نسل سے ہیں -ملک کی وادیوں میں کپاس کی کاشت اور کھیتی باڑی خاص مشاغل ہیں . بلندی پر سطح مرتفع پامیراور دوسرے پہاڑی سلسلوں کی ڈھلانوں پر گلہ بانی کاکام وسیع پیمانے پر ہے - یہیں سے ایرانی بھیڑوں کاوہ پشمینہ حاصل کیا جاتا ہے جو امریکی دکانوں میں بکتا ہے -کاسک آبادی کابیشتر حصّہ اور بالخصوص ملک کی مشرقی سطح مرتفع کے کِرغیز اب بھی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں -اپنے گھوڑے اور اونٹوں کے گلّوں اور کھُردرے نمدی خیموں کو لے کر وہ اس لامتناہی میدان میں جگہ جگہ پھرتے ہیں اور کبھی یہاں کبھی وہاں تھوڑا تھوڑا وقت ٹھہرتے ہیں .مستقل قیام کہیں نہیں کرتے .

ان لوگوں کا ماضی طویل اور شاندار ہے . تین سو تیس سال قبل مسیح سمرقند بہت بڑا اور امیری ٹھاٹھ کا شہر تھا . مقدونیا کے مشہور فاتح سکندر اعظم نے جو اس شہر کو فتح کرنے کے لیے بے تاب تھا ایک خونریز معرکے کے بعد اس پر قابض ہوا تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں عظیم منگول بادشاہ چنگیز خان اور پھر امیر تیمور نے سمرقند

کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور منگولوں، کرغزیوں، اُوزبکوں، اور ترکمانوں کو باہم ملاکر ایک عظیم طاقتور سلطنت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ہنگامی منفعت کے ولولے اور اسلامی جوش کے زیر اثر انھوں نے سمرقند سے بے شمار مہمیں چلائیں۔ امیر تیمور چین، ہندوستان، ایران، ترکی اور دوسرے ملکوں پر چھا گیا۔ خود روس نے صدیوں تک ان حملوں کے زخم کھائے۔ جن کے مقابلے میں کریمیا کے تاتاریوں کی یورشیں محض سوئی چبھنے کے برابر تھیں۔

اس زمانے میں سمرقند دنیا کے متموّل ترین شہروں میں سے تھا۔ اس میں سونے اور جواہرات کے لاانتہا خزانے تھے۔ تیمور کے دربار میں علوم و فنون کو بے حد عروج ملا۔ بڑے بڑے مہندس، ہیئت داں معمار اور شعرا سمرقند میں جمع ہوگئے۔ اس کی وسیع مساجد جو اب خستہ حال ہیں اس کی گزشتہ عظمت وشوکت کا افسانہ زبانِ حال سے کہتی ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ تیمور کی مملکت بھی منتشر ہوگئی۔ اس کا وسط ایشیائی حصّہ چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں میں بٹ گیا جو مدتوں آپس میں برسرِ پیکار رہیں جنگ وجدال نے نظامِ آبپاشی برباد کر دیا اور ملک کا بیشتر حصّہ ہولناک قحط سے دو چار ہوا۔ مذہبی اور سیاسی جوش وولولے جنھوں نے کبھی ترکمانوں، اوزبکوں اور کرغزیوں کو کارہائے نمایاں کرنے پر ابھارا تھا ختم ہوگئے۔ وہ اس جھلسے ہوئے ملک میں صدیوں کی طویل بے حسی اور خاموش گہری سوچ کی مشرقی نیند میں سو گئے۔ ۱۸۶۸ء اور ۱۸۸۴ء کے مابین روسی حکومت نے وسط ایشیائی مملکتوں اور ریاستوں کو جنگ سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے فتح کر لیا اور لوگوں نے برضا و رغبت روسی تسلط قبول کر لیا۔ ریل کی سڑکوں کی تعمیر اور ملک میں بہتر نظام حکومت قائم کرنے سے مرکزی ایشیا میں خوشحالی اور ترقی نے پھر راہ پائی۔

پچھلے پچاس ساٹھ سال میں مرکزی ایشیا نے بہت کچھ حاصل کیا ہے ۔ جھیل بالکش کے کنارے کنارے ملک کے مشرقی حصے میں تانبے اور دوسری قیمتی دھاتوں کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں بہت سی کانیں کھودی گئی ہیں اور دھاتیں پگھلانے کے کارخانے قائم کیے گئے ہیں ۔ علاقے کے شمال میں کراگنڈا کے مقام پر کوئلہ نکالا جاتا ہے ۔ ملک کے بہت سے حصوں میں تیل نکالنے کا اہتمام ہے ۔ سب سے اہم یہ کہ وسط ایشیا کے پورے نظام آبپاشی کو وسعت اور ترقی دی گئی ہے ۔ پہلے یہاں کے باشندوں کے پاس ایک دقیانوسی مگر وسیع کاریزوں کا جال تھا ۔ اب متعدد علاقوں میں آب پاشی کی نہریں ستّر اسّی بلکہ ایک سو دس میل لمبی کھودی گئی ہیں جہاں ضرورت ہے وہاں بجلی کے کارخانے پہاڑیوں پر پمپ سے پانی چڑھاتے
۶۶ ہیں اور ان میں بڑی نالیوں سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے کاریز بہت بڑے رقبے کو سیراب کرتے ہیں ۔ سطح مرتفع پامیر کے دامن میں واقع شاداب وادی فرغانہ میں آبپاشی کی اس نہر نے آٹھ لاکھ پچاس ہزار ایکڑ رقبے کی اس زمین کو جو کبھی تمازتِ آفتاب سے جُھلسی ہوئی تھی شاداب کردیا ہے ۔

آبپاشی کے منصوبوں نے مرکزی ایشیا کی کپاس کی پیداوار بہت بڑھادی ہے ۱۹۲۵ء میں اُوزبک اور تاجیک خانگی ضروریات سے کچھ ہی زیادہ کپاس پیدا کرسکتے تھے ۔ سوویٹ یونین کو کپاس کی بڑی مقدار بیرونجات سے برآمد کرنی پڑتی تھی ۔ ۱۹۴۰ء میں مرکزی ایشیا نے کپاس کی اتنی زیادہ مقدار پیدا کی کہ پورے روس کی ضروریات کو کافی ہوئی ۔

مرکزی ایشیا کا عظیم شہر تاشقند جو سمرقند کے شمال مشرق میں واقع ہے پچھلے چند سالوں سے نو لاکھ کی آبادی کا بہت بڑا صنعتی مرکز بن گیا ہے ۔ اس میں دریائے چرچک پر پن بجلی کا بہت بڑا کارخانہ ہے ۔ اتنا ہی بڑا ایک کیمیاوی کارخانہ

اور دوسرے صنعتی مرکز ہیں ۔ کپڑے کے بڑے بڑے کارخانے یہاں اور ملک کے دوسرے شہروں میں قائم کیے گئے ہیں ۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۹ء کے سالوں میں مرکزی ایشیا نے سوویٹ روس کے خلاف سخت بلوے کیے جو بڑی بے رحمی سے دبا دیے گئے ۔

ان کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ اشتراکیوں نے باشندوں کے مذہبی احساسات اور روایات کو سخت ٹھیس لگائی ۔ علاوہ بریں سوویٹ حکومت نے انھیں کپاس کی پیداوار سرکاری مقررہ کردہ قلیل نرخوں پر بیچنے کے لیے مجبور کیا ۔ اب یہ قصہ پرانا ہو چکا ہے ۔

مرکزی ایشیا کے مشرقی حصے میں پہنچ کر آپ "ترک سب" ریل گاڑی پر سوار ہو سکتے ہیں ۔ یہ لائن ملک کے مشرقی حصے کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جاتی ہے اور انجام کار نوووسی برسک کے مقام پر ٹرانس سائبیرین ریلوے سے مل جاتی ہے ۔

نوووسی برسک پہنچ کر آپ گاڑی تبدیل کریں اور مشرق کی جانب سائبیریا کے "تائیگا" کے پار جس سے آپ بہ خوبی واقف ہیں ولادی واسٹک کو روانہ ہوں ۔ وہاں سے بحرالکاہل کا جہاز آپ کو واپس ریاستہائے متحدہ امریکہ لے جائے گا ۔

رُوس کیسے بنا

مذکورہ بالا تفصیلات سے ان بڑے علاقوں کے حالات واضح ہوگئے ہوں گے جن پر سوویٹ یونین مشتمل ہے۔ ساتھ ہی اس کی وسعت وعظمت کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا۔ پورے کرّہ ارض کا چھٹا حصّہ روسی سرزمین ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، ایلاسکا، جزائر ہوائی اور فلپائن کے مجموعے کا اڑھائی گنا سوویٹ یونین کے برابر ہوگا جو ایک عظیم مسلسل خطّۂ زمین ہے۔ اس کی حدود میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا یوکرین کے غربی حصّے میں جب رات کی تاریکی چھانے لگتی ہے تو ولادی واسٹک کے اُفق پر سورج طلوع ہونے لگتا ہے۔ مشرق سے مغرب کو سفر کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ روس کے باشندے نئے سال کے ورود کی تقریب دس مختلف گھنٹوں میں مناتے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں سوویٹ یونین کی آبادی بیس کروڑ نوّے لاکھ تھی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سترہ کروڑ ساٹھ لاکھ۔ روس کے یہ بیس کروڑ نوّے لاکھ شہری سب روسی نسل کے بھی نہیں۔ مذکورہ بالا حالات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ کئی اقوام مثلاً تاتاری، جارجی، ترکمان اور ازبک قبیلے روسیوں کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصّوں میں بستے ہیں۔ یہ تمام غیر روسی قومیں جن میں سے بعض کا ذکر نہیں کیا گیا پانچ کروڑ تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہیں۔ مگر روس کے پندرہ کروڑ ساٹھ لاکھ باشندے خالص روسی ہیں۔ خواہ وہ خاص روسی ہوں یا یوکرین والے ہوں یا سفید روسی ہوں۔

اس طرح آبادی میں روسی نسل کی بھاری اکثریت ہے۔ مزید برآں انہیں ملک میں ہمیشہ نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ روس کی تاریخ اُنہی نے بنائی ہے اور انھوں نے ہی سوویٹ یونین کو اس کی موجودہ بلندیوں پر پہنچایا ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ روسی کون ۶۸
ہیں؟ اور قدرتی وسائل سے معمور اس وسیع و عریض ملک کے وہ کیوں کر مالک بنے تو جواب یہ ہے کہ روسی سلاوی (سلافی) یا سلاوانی قوم کی مشرقی شاخ ہیں۔ ان کے علاوہ اس گروہ میں مغربی سلاوی یعنی پولستانی، زیکو سلاوی اور جنوبی سلاوی یعنی اہلِ سرویا اور بلغاری بھی شامل ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ماضی بعید میں یہ ایک ہی نسل کے لوگ ہوں جو متفرق قبیلے بن کر کوہستان کارپیتھین دریائے نیپر اور دریائے وسچولا (جو اب پولینڈ میں ہے) کے درمیانی وسیع رقبے میں بس گئے۔ یہ لوگ ضرور ایک ہی مشترکہ سلاوی زبان بولتے ہوں گے۔ پھر کسی نامعلوم زمانے میں سلاوی موجودہ شاخوں میں بٹ گئے اور ان کی زبانوں میں بھی فرق آگیا۔ لیکن ان مختلف سلاویوں کی زبانوں میں اب بھی بہت کچھ مشابہت ہے۔ مثلاً یہ کہ ان میں الفاظ کے قدیم سلاوانی مادّے وہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی روسی یا پولستانی کے لیے زیکو سلاوی یا سروی زبان کا سیکھنا کسی غیر سلاوی زبان مثلاً فرانسیسی، انگریزی یا ہسپانوی کی نسبت آسان ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ مشرقی یعنی روسی سلاوی کی پہلی صدی عیسوی میں کیا کر رہے تھے؟ مورّخ اس سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کے علم کا ماخذ ابتدائی قسم کے سکّوں (جو پرانی قبروں سے ملے ہیں)، بعض دریاؤں اور مقامات کے ناموں یا یونان و روما کے کسی مورّخ کے ایک آدھ فقرے کے سوا کچھ نہیں۔ صرف آٹھویں اور نویں صدی عیسوی سے روسی سلاویوں کی قسمت کا ستارہ ماقبل تاریخ کے دھندلکے سے نمودار ہوتا ہے۔

اس وقت روسی قبائل دریائے نیپر کے طاس میں (انتہائی جنوب کا علاقہ چھوڑ کر) اور
نیپر کے شمال میں بحیرۂ بالٹک کے ساحل تک کے صحرائی علاقے میں آباد تھے وہ زیادہ تر دریاؤں
کے ساحلوں پر رہتے تھے اور اپنے تئیں نہ سلاوی کہتے تھے نہ روسی بلکہ جن علاقوں میں وہ بود و باش ۶۹
رکھتے تھے اُنہی کے نام اور کیفیت سے منسوب تھے ۔ یعنی دریائے نیپر کے مغربی علاقے میں
بسنے والے قبائل کا نام "پولیانی" یا میدانی ہوا اور بالائی جانب جنگلات کے باشندے "دریولیانی"
یا جنگلاتی لوگ کہلائے ۔

ان اوّلین روسیوں کے پیشے زیادہ تر شکار اور ماہی گیری تھے ۔ کبھی کبھار جلانے کے بعد صاف کیے ہوئے جنگل کے کچھ حصّوں میں اناج بھی بو لیتے تھے مگر زراعت کی اہمیت انہیں بہت مدّت بعد معلوم ہوئی ۔ ان کا کوئی مذہب نہ تھا وہ فطرت کی مختلف قوتوں یعنی سورج ، رعد ، اور بارش کی پرستش کرتے اور ان قوتوں کے نمائندہ بُت بنا کر پُوجتے تھے ۔ ان بتوں کے سامنے انسانوں کی قربانیاں بھی دی جاتی تھیں ۔

نویں صدی کے آغاز تک روسی سلاویوں کے دو شہر یا یوں کہیے کہ دو بڑی دیہاتی آبادیاں بن گئی تھیں جہاں یہ لوگ غیر ملک والوں سے ضروریات کا مبادلہ کرنے لگے ۔ ان شہروں میں سے ایک تو کیف تھا اور دوسرا اسی اہمیّت کا نووگراڈ تھا جو جھیل ایلمن کے کنارے موجودہ لینن گراڈ سے ایک سو پچاس میل جنوب میں واقع تھا ۔ کیف کی طرح نووگراڈ اب بھی موجود اور نوّے ہزار آبادی کا صوبائی شہر ہے ۔

اس عہد کے روسیوں کی تو نہ کوئی ریاست تھی نہ باقاعدہ حکومت ۔ وہ قبائلی نظام کی زندگی بسر کرتے تھے ۔ چند قرابت دار خاندان باہم مل کر سب سے معمّر شخص کی ہدایات پر کاربند ہونے کا عہد کرتے تھے ۔ پھر ان خاندانی گروہوں کے سربراہ اپنی ایک مجلس بنا کر قبیلے کے مسائل کا فیصلہ کرتے تھے ۔ لیکن ہمسایہ قبائل پر ان فیصلوں کی پابندی لازم نہ تھی ۔ غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول نے پراگندہ روسی قبائل کو متحد

کر کے ایک ریاست کے قیام پر ابھارا۔ یہ غیر ملکی زیادہ تر "ورنجی" تھے۔

روسی سلاوی لوگ سویڈن اور ناروے کے رہنے والے نارمنوں کو "ورنجی"
کہتے تھے۔ رسوائے عالم بحری ڈاکوں کی سرگرمیاں ان دنوں بالخصوص اوج پر تھیں۔ یہ
لوگ حد درجہ بے باک، جنگجو اور اعلیٰ پائے کے جہازراں تھے اس لیے ان کی تیز رو ۷۰
کشتیاں جہاں کہیں نمودار ہوتیں لوگوں کو دہشت اور خوف سے لرزہ براندام کر دیتیں
وہ مغربی یورپی ساحل کے ساتھ ساتھ رہتے۔ انھوں نے حملہ آور ہو کر انگلستان کا
بہت سا حصہ فتح کر لیا۔ اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ اور فرانس پر بار بار یورشیں کیں بلکہ
نیپلز اور دوسرے اطالوی شہروں میں بھی لوٹ مار مچائی۔

روسی سلاوی انتہائی فلاکت زدہ تھے۔ ان کے قبیلے دور افتادہ تھے لہٰذا وہ لیٹروں کے لیے باعثِ کشش نہ تھے۔ مگر ایک اور چیز نے ان بحری ڈاکوؤں کی توجہ سلاویوں پر مرکوز کر دی۔

وہ تھی یورپ کے جنوب مشرقی حصے اور ایشیائے کوچک میں واقع ایک نہایت متموّل سلطنت۔ اس کی آبادی زیادہ تر یونانی تھی اور اس کا دارالحکومت قسطنطنیہ یا بزنطینہ دولت و ثروت، جاہ و جلال اور لطافتِ فن میں تمام یورپی شہروں پر سبقت لے گیا تھا۔ یہ ایک بے بہا انعام تھا مگر مغرب کی جانب سے داخل ہو کر اس پر قبضہ کرنا انتہائی مشکل تھا۔ کیوں کہ اس طرف سے حملہ آور ہونے کے لیے ڈاکوؤں کو پورے یورپ کے گرد چکّر لگا کر بحیرۂ روم کو پار کرنا ضروری تھا۔ علاوہ بریں یونانی ان کی کشتیوں کو قسطنطنیہ کے جنوبی تنگ راستے یعنی آبنائے دانیال میں آسانی سے روک سکتے تھے۔ اس لیے سب سے مختصر اور اچھا راستہ روسی سلاویوں کی سرزمین سے گزر کر تھا۔

بحیرۂ بالٹک سے کشتیاں دریائے نیوا کی راہ جھیل لڈوگا تک جا سکتی تھیں۔

اور وہاں سے دریائے والخاو سے ہوکر جھیل ایلمن کے کنارے واقع نوود گراڈ پہنچ سکتی تھیں ۔ جنوب میں دریائے لوات بہتا ہوا جھیل ایلمن میں گرتا ہے اس لیے نوووگراڈ سے لوات کو پار کرکے دریائے ڈینپر کے منبع سے ملے ہوئے علاقے میں داخلہ بالکل



ممکن تھا ۔ یہاں کشتیوں کو چوبی پہیوں پر رکھ کر خشک زمین پر کھینچ سکتے تھے ۔ بس ایک مرتبہ دریائے ڈنیپر تک پہنچ گئے تو اس کا طاس آسان گذرگاہ مہیا کر دیتا ۔ ہاں کیف سے نیچے کی طرف کچھ رکاوٹیں تھیں ۔ زاپوروزہی کے قریب (جہاں سوویٹ حکومت نے بڑا بند تعمیر کیا) خطرناک بھنور تھے مگر یہاں بھی کشتیوں کو زمین پر کھینچا جا سکتا تھا ۔ ایک مقام سے یعنی بھنور کے عین نیچے زیریں حصّہ دریائے ڈنیپر کے ساتھ ساتھ اور بحیرۂ اسود کے پار کا راستہ بزنطینہ کے بالکل قریب ساحلِ یونان تک لے جاتا تھا ۔

روسی سلاوی اس راستے کو " ورنجیوں سے یونانیوں تک کی شاہراہ " کہتے تھے کیونکہ یہ راستہ بحری ڈاکوؤں نے بزنطینی سلطنت کے ساتھ رابطوں کے لیے انتخاب کیا تھا ۔

نویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بحری ڈاکوؤں نے یونانیوں کے ساتھ تجارت شروع کی ۔ مگر ۸۶۰ء میں اسی شاہراہِ اعظم کے ذریعے بحیرۂ اسود میں داخل ہو کر انہوں نے قسطنطینیہ پر حملہ کر دیا ۔ وہ اسے سر تو نہ کر سکے لیکن ان خطرناک ڈاکوؤں کو مطمئن کرنے کے لیے بازنطینیوں نے فدیہ دے کر صلح کر لی ۔

روسی دریاؤں میں اوپر نیچے کشتیاں چلاتے ہوئے اور آمد و رفت کے دوران میں کیف اور نووگراڈ میں قیام کرتے ہوئے باشندگانِ ناروے نے اس گروہ کے ساتھ قریبی مراسم قائم کر لیے گو ان کی صحیح نوعیت معلوم نہیں ۔ بہ ظاہر کچھ تجارتی تعلقات ہوں گے اور بہت ممکن ہے جنگ و جدال کا سلسلہ بھی ہو ۔ خیر کچھ ہی ہو مگر ان سب کا نتیجہ ایک اہم واقعہ کی صورت میں ضرور رونما ہوا ۔ یعنی ۸۶۰ء کے لگ بھگ اس غیر ملکی نسل کا ایک سردار جسے روسی سلاوی ریورک کہتے تھے اور جس کا اصلی نام قدیم اسکنڈے نیوین زبان میں ہرورِیکر تھا نووگراڈ کا رئیس بن گیا اور اپنے بھائیوں

عزیزوں اور جنگجو سپاہیوں کا دستہ بھی ساتھ لے آیا۔

یہ کیسے اور کیوں کر ہوا؟ اس کے متعلق دوسو سال بعد ایک عالم روسی راہب
نیسٹر نامی نے جو اب لاورا راہب خانہ واقع کیف میں دفن ہے اپنی یادداشت
میں بیان کیا ہے کہ "ورنجی" سمندر پار سے آکر اہالیانِ نووگراڈ کے ساتھ برسرِپیکار
ہوتے تھے اور انھیں بھاری زرِ فدیہ دینے پر مجبور کرتے تھے۔ انجام کار یہ لوگ ان
لڑائیوں سے تنگ آکر حملہ آوروں کی مدافعت پر تُل گئے اور شکست دے کر انھیں اپنے علاقے
سے نکال باہر کیا۔ مگر اب نووگراڈ داخلی اختلافات اور انتشار کا شکار ہوگیا۔ ایک
قبیلہ دوسرے کے ساتھ بھڑ گیا۔ بہت خون بہا اور مظالم عام ہوگئے۔ تنگ آکر نووگراڈیوں
نے بدنظمی کو روکنے کے لیے ایک رئیس کے تقرّر کا فیصلہ کیا۔ ان کے قاصد رُس نامی ورنجی
قبیلے کے پاس پہنچے اور پیغام دیا کہ ہماری سرزمین وسیع اور زرخیز ہے مگر بدنظمی کا
شکار ہے۔ آپ یہاں آکر ہمارے حکمراں ہوں۔ اس قبیلے کے ایک سردار ریورک
نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ راہب نیسٹر کی کہانی کا شاید کچھ حصّہ ہی صحیح ہو۔ کیونکہ اس نے
۷۳ اسے واقعہ کے دوسو سال بعد لکھا اور زبانی روایات کا سہارا لیا جو باپ سے بیٹے کو منتقل
ہوئیں واضح ہو کہ اس صورتِ حال سے واقعات میں کہیں ہیر پھیر اور کہیں رنگینی آجانا
بہت ممکن ہے۔ بدیں وجہ موجودہ مورخ باور نہیں کرتے کہ نووگراڈیوں نے ان غیر ملکیوں
کو اپنے سفیر بھیجے ہوں گے۔ راہب نیسٹر کے بیان کا اتنا حصّہ ہی معقول معلوم ہوتا ہے کہ ریورک
اور اس کے سورما نووگراڈ پر قابض تو ہوئے مگر فاتحانہ نہیں بلکہ باشندوں کے ساتھ عہد و پیمان
کرکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیرونی لوگ اس شہر میں آتے جاتے رہے اور متعدّد موقعوں پر
نووگراڈیوں کے ساتھ کچھ تجارتی سودا بازی کی اور انجام کار نووگراڈیوں نے انہیں اپنے علاقوں
میں فوجیوں اور منتظموں کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔

بہرحال نووگراڈ میں ریورک کی تخت نشینی نے روس کے مستقبل کی تاریخ کا

دھارا متعین کر دیا۔

تاریخ ریورک کی سرگرمیوں کا بہت کم پتا دیتی ہے مگر اس کے قرابت دار اور فوری جانشین اولگ (جو پرانی اسکینڈی نیوی زبان میں ہیلگی ہے) کے متعلق زیادہ روشن تحریریں ملتی ہیں۔ اولگ بڑا طاقتور اور قابل شخص تھا اور اس نے بڑے کارہائے نمایاں کیے۔ کہیں جنگوں اور کہیں حکمت عملی سے اس نے اپنی حکومت ان روسی سلاویوں تک وسیع کر لی جو نوووگراڈ کے جنوب میں سمالینسک اور لیوبیک کے چھوٹے چھوٹے شہروں کے اردگرد بس آباد تھے۔ پھر وہ کیف کی طرف بڑھا مگر وہ پہلے ہی آسکولڈ اور ڈیر نامی دو سورماؤں کے قبضے میں تھا جو ریورک کی فوج سے باغی ہو کر کسی طرح وہاں آ بسے تھے۔ کسی فریب سے اولگ نے انہیں شہرپناہ سے باہر آنے پر مائل کر لیا اور کسی شاہی خاندان سے متعلق نہ ہونے کی بنا پر غاصب ٹھہرا کر مار ڈالا اور یوں کیف بھی حاصل کر لیا۔

یقیناً یہ انتہائی مذموم فعل تھا مگر اس لمحے سے روسی قبائل پہلی بار ایک مرکزی حکومت میں شامل ہو کر ایک خاندان کے زیرِ فرمان آئے۔ اسکینڈی نیوی نسل کے شہزادوں نے نئے ملک پر اپنے خاندان کی حکومت قائم کی اور سب سے معمّر شہزادے نے عظیم ڈیوک کا لقب اختیار کر کے بڑے شہر (نوووگراڈ) کو راج دھانی بنایا۔ اس کے بھائی، بیٹے اور بھتیجے حسبِ مراتب چھوٹے شہروں کے ناظم بنے۔ سب کے لیے عظیم ڈیوک کی فرمانبرداری لازمی سمجھی گئی ۹۱۲ء میں اولگ کی وفات کے بعد ریورک کا بیٹا اِگور (یا انگوار) عظیم ڈیوک بنا۔ اس نے اپنا دارالحکومت نوووگراڈ کے بجائے کیف مقرر کیا جو بعد ازاں اِس نئی ریاست کا صدر مقام بنا رہا۔

اگور بھی ایک شمالی اسکینڈی نیوی تھا۔ اس نے شادی بھی اپنی ہم قوم خاتون اولگا (یا ہیلگا) نامی سے کی۔ مگر بعد ازاں ریورک کی اولاد اور سورماؤں نے روسی قوم میں شادیاں کیں۔ ایک صدی بعد وہ ایسے گھل مِل گئے کہ اپنی پہلی زبان بھول کر صرف

روسی بولنے لگے اور قطعاً روسی بن گئے ۔ روس والے بھی انھیں اپنا ہم قوم شاہی خاندان سمجھتے تھے ۔ اسی حیثیت سے انھوں نے یہاں حکومت کی اور روس کی آئندہ سات سو سالہ تاریخ بنائی ۔

ابتدائی روسی سلاویوں کے پاس "روس" کا لفظ نہ تھا مگر وہ ریورک کے قبیلے کو رُس ضرور کہتے تھے اور نووگراڈ اور کیف میں اسکینڈی نیوی شہزادوں کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد وہ اپنے ملک کو رُس کہنے لگے اور خود بھی روسی کہلانا شروع کر دیا ۔ ان کوائف کی رو سے روس اسکینڈی نیویوں کے ورود پر معرض وجود میں آیا اور اس کی تاریخ کا آغاز ہوا ۔

اولیگ ایک اُجڈ قسم کا سیدھا سادہ سپاہی تھا جو اپنے نئے ملک کو حملہ آوروں سے بچانے یا ہمسایوں پر غلبہ پانے کے لیے اکثر ہتھیار بند اور اسپ سوار رہتا تھا ۔ چونکہ وہ ایک نڈر ، بے باک اور اعلیٰ صلاحیتوں کا فوجی سردار تھا ان مہموں میں فتح وظفر ہمیشہ اس کی ہمرکاب رہی ۔ امن کے دنوں میں جب وہ ہتھیار کھول دیتا تو ملک کا انتظام ایسی فراست اور سادہ ہوش مندی سے کرتا جیسے کوئی کفایت شعار زمیندار اپنے مزروعے کا انتظام کرتا ہے ۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ انصاف اور شفقت کا سلوک کرتا اس لیے سب لوگ اسے بے حد عزیز رکھتے تھے اور ان کی نگاہوں میں وہ ایک مثالی ہیرو تھا ۔ صدیوں تک اس کے کارنامے روسی روایتی ادب میں غزلوں ، مثنویوں اور رزمیہ نظموں کا موضوع بن کر گائے جاتے رہے ۔

اس کا جانشین اِگور ان صفات کا حامل نہ تھا ۔ اس کی بے انصافی ، حرص اور لالچ سے لوگ بے زار ہو گئے اور یہی آخرالامر اس کی بربادی کا سامان بنا ۔ ایک
۷۵ شہر کے باشندے جن سے اس نے مقررّہ ٹیکس سے دوگنا وصول کرنے کی کوشش کی بغاوت پر اتر آئے اور اسے مار ڈالا ۔ وقائع نگار راہب نیسٹر بتلاتا ہے کہ اِگور

کی بیوہ اولگا نے اپنے شوہر کے قتل کا بدلہ لیا۔ وہ اپنی فوج لے کر باغی شہر کے دروازے پر آئی۔ لوگ چوبی دیواروں کے پیچھے چھُپ گئے۔ اولگا نے جنگ کا کوئی اقدام نہ کیا۔ ان سے صرف یہ جرمانہ مانگا کہ ہر گھر تین کبوتر اور تین چڑیاں پیش کرے۔ خلاف توقع یہ معمولی سزا سن کر لوگوں کی جان میں جان آئی اور انہوں نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ مگر جب یہ پرندے پیش کیے گئے تو اس نے حکم دیا کہ کول تار لگے ہوئے پٹ سن کے ریشے انکے پنجوں پر باندھ دیے جائیں۔ پھر اس کول تار کو آگ دکھائی اور پرندے چھوڑ دیے جو قدرتی طور پر شہر میں اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑے۔ اب چاروں طرف شعلے اٹھنے لگے۔ لوگوں نے بھاگ نکلنے کے لیے پھاٹک کھول دیے اور بلا مزاحمت خاموشی سے اولگا کی باہر کھڑی فوج سے ہار مان کر مطیع ہو گئے۔ اس نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو سخت سزائیں دیں مگر باقی شہریوں کے ساتھ مہربانی کی۔ یہ اقدام اس کی فراست اور عیاری کا پہلا مظاہرہ تھا۔ بہت جلد دوسرے کارناموں سے اس نے اپنی فراست کے مزید ثبوت بہم پہنچائے۔ اولگا اعلیٰ پائے کی دانش مند نہایت زیرک اور رعایا میں بے حد ہر دلعزیز ملکہ تھی۔ اس کے عہد کے لوگوں نے اور بعد ازاں راہب منیسٹر نے اسے "فہیم ترین خاتون" کہا۔

پرانے اسکینڈی نیوی جذبے کے زیرِ اثر ہوکر روسی شہزادے بسا اوقات قسطنطینہ پر ڈاکے ڈالتے رہتے۔ اسی اثر سے ۹۰۷ء میں اولگ نے بزنطینہ (قسطنطینہ) کے نواح میں غارت گری کی اور اسے محصور کر کے یونانیوں سے بھاری خراج وصول کیا حسنِ اتفاق سے اسی واقعے نے روسیوں میں اس کی ساکھ بڑھا دی۔ رفتہ رفتہ اہلِ کیف بزنطینہ کے ساتھ جنگ کی نسبت تجارتی روابط کا قیام زیادہ اہم سمجھنے لگے۔ یوں بھی روسی معاشرے کا انحصار اب تجارت پر ہی زیادہ ہونے لگا تھا۔

موسم سرما میں کیف کے عظیم ڈیوک نے اپنے سرداروں اور سورماؤں کو ساتھ

لے کر تمام ملک کا دورہ کیا اور اس دوران میں اپنے ان بیٹوں اور بھتیجوں کا بھی محاسبہ کیا جو ماتحت ریاستوں کے ناظم بن کر عدالتی فیصلے کرتے اور ٹیکس مقرر کرتے تھے۔ یہ ٹیکس نقد بھی ادا کیا جا سکتا تھا مگر بیشتر حصہ جنس یعنی سمور، کھالوں، اشیائے خوردنی، شہد اور موم کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ تمام سامان قریب ترین دریا کے کنارے جمع کر دیا جاتا تھا اور موسمِ بہار آنے پر جب برف پگھلتی تو کشتیوں کے ذریعے کیف پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس طرح ان اشیائے تجارت کا جن سے روس بھرپور تھا بہت بڑا ذخیرہ شہر میں جمع ہو جاتا۔ موسمِ گرما کے آغاز میں لمبی کشتیوں کا بیڑا جن میں سے ہر ایک میں دو تین ٹن وزن اور چالیس یا پچاس آدمیوں کے لیے گنجائش تھی وہاں آن کھڑا ہوتا تھا۔ رئیس کے فوجی سورماؤں کی حفاظت میں پورا قافلہ جس کے ساتھ بہت بڑی تعداد نجی تاجروں کی کشتیوں کی بھی ہوتی تھی تیار ہو کر بزنطینہ روانہ ہو جاتا تھا۔ دوسرے سال کی بہار میں یہ بیڑا وہاں سے ریشم، کپڑا، دھات کا سامان، شراب، میوے اور سونا لاد کر واپس آتا تھا۔

روسی قافلے ہمیشہ امن و امان سے بلا مزاحمت بزنطینہ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ عہدِ قدیم سے کیف کے جنوب میں واقع گیاہستان کا میدان ایک گلی کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مختلف جنگلی اقوام اس میں سے گزر کر ایشیا سے یورپ جایا کرتی تھیں، اولگ کی وفات کے بعد انہی اقوام کا پیچی نیگ نام کا گروہ مغربی جانب سے ابھرا اور گیاہستان سے گزر کر صوبۂ کیف کی جنوبی حدود پر آنکلا۔ جب روسی کشتیاں زیپوروزھی سے اوپر طوفانی بہاؤ سے بچنے کے لیے زمین پر کھینچی جاتیں تو پیچی نیگ کے لشکر گھات سے نکل کر ان پر حملہ کرتے۔ انہی حملوں میں ایک مرتبہ کیف جاتے ہوئے اولگا کا بیٹا عظیم ڈیوک سودیاتو سلاف مارا گیا تھا اور پیچی نیگ سردار نے اس کی کھوپری سے پینے کا پیالہ بنایا تھا۔ مگر عموماً عظیم ڈیوک کے فوجی سورما اپنی تعداد اور طاقت کے بل پر ان لیٹروں کو پسپا

کر دیتے تھے اور قافلے یہ مشکل راستے طے کر کے صحیح وسالم منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے تھے۔ بزنطینہ کی تجارت کے علاوہ روسیوں نے دریائے ڈینیوب کے راستے مغرب میں مملکتِ ہنگری کے ساتھ بھی تجارت شروع کی تھی۔ روسی کشتیاں نووگراڈ سے بحیرۂ بالٹک کے راستے جرمن بندرگاہوں میں بھی جاتیں اور آخر میں ایک ایشیائی قوم خزار نامی کے ساتھ بھی جو زیریں والگا اور شمالی قفقاز کے درمیانی علاقے کے باشندے تھے بڑے پیمانے پر تجارتی سلسلہ چلا۔

اس طرح چار دانگِ عالم سے کیف میں دولت و ثروت اُمڈنے لگی۔ بزنطینہ ٧٧
کے ساتھ تجارت سے کیف کو بہت بڑا مادّی فائدہ ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر کچھ اور بھی تھا۔

روسی اور ان کے دسویں صدی کے رؤساء بہت غیر مہذب اور اجڈ تھے جو کرگھے کے بُنے ہوئے کپڑے اور جانوروں کی کھال کا لباس پہنتے تھے۔ ان کی زندگی میں بڑی بہیمیّت اور بربریت تھی۔ شہروں میں ابتدائی قسم کے چوبی گھر اور مٹی کے جھونپڑے تھے۔ ان کے پاس تحریری زبان نہ تھی اس لیے وہ علم کا ذخیرہ جمع نہ کر سکتے تھے۔ مگر جب یہ غیر مہذب لوگ بزنطینہ پہنچے تو انھوں نے وہاں اس دَور میں روئے زمین کی اعلیٰ ترین تہذیب کا حُسن وجمال، دولت وثروت اور لطافت ونزاکت دیکھی۔ انھیں پتھر کے بنے ہوئے چار اور پانچ منزلہ مکانات، عمدہ باغات اور شاندار شاہی محلّات نظر آئے۔ ان کی نگاہوں نے گلگونہ اور غازہ لگائے ہوئے چہروں والی بیش قیمت ملبوسات اور زیورات سے آراستہ پیراستہ خواتین کے ساتھ مردوں کو شریفانہ گفت گو میں مصروف دیکھا۔

بعض روسیوں نے قسطنطنیہ کے مشہور ترین کلیسا سینٹ سوفیہ میں داخل ہونے

ی جرأت کی۔ یہاں دنیا کے عظیم ترین گنبد کے تلے نزک و احتشام سے عبادت کی بے مثال رسم ادا ہوتے دیکھی۔ سفید و سیاہ عباؤں میں ملبوس پادریوں کو معطّر دھونیوں کی فضاؤں میں تیرتے دیکھا۔ گرجا کی بلند محرابوں میں پوشیدہ نغمہ سراؤں کو حمدِ خداوندی کے بھجن گاتے ہوئے سنا اور زیریں حصّۂ عبادت گاہ میں زرق برق لباس پہنے ہوئے ہجوم میں شہنشاہ اور ملکہ کو ایک اَن دیکھے معبود کی بارگاہ میں جھُکتے دیکھا۔

روسی اس کلیسا سے بڑے متاثر ہوئے یہ تقریب کی ظاہری شوکت کا سحر ہی نہ تھا۔ کیف کی نواحی پہاڑیوں پر بے سلیقہ اور بے ڈھب تراشے ہوئے تبوں کے مقابلے میں جن کے سامنے بے رحمی سے انسانی جانوں کی قربانیاں پیش کی جاتی تھیں یہاں آکر انہیں قدرۃً عیسائیت کی اخلاقی صداقتوں کا احساس ہوا۔

اس طرح بزنطینہ کے تہذیبی نظریات اور مسیحی تصوّرات کیف میں اثر پذیر ہونے لگے اور دسویں صدی کے آغاز میں اِگور کے بہت سے سورما عیسائی ہوگئے

اپنی زندگی کے آخری ایّام میں دانشمند اولگا نے یونانی مذہب اختیار کرلیا ۷۸
۹۵۷ء میں وہ بزنطینہ کی زیارت کے لیے آئی۔ شہنشاہ کے ساتھ گفتگو کے وقت تو اس کا وقار اور رکھ رکھاؤ قائم رہا مگر یونانی کلیسا کے سربراہ پادری کے سامنے بے حد مؤدب ہوگئی۔ اولگا نے اپنے بیٹے سویا تو سلاف کو عیسائیت کی بہت ترغیب دی مگر وہ نہ مانا۔ اس نے علانیہ اعتراف کیا کہ ایسا کرنے سے اس کے سپاہی برگشتہ ہوجائیں گے۔ کیونکہ ان کی اکثریت بُت پرست تھی اور اس دَور کے بُت پرستوں کی نگاہ میں عیسائیت ایک زنانہ قسم کا مذہب تھا۔

تاہم سویا تو سلاف کا بیٹا عظیم ڈیوک ولاڈی میر نہ صرف خود عیسائی ہوا

بلکہ اپنے تمام ملک میں بھی یہی مذہب رائج کر دیا۔

ممکن ہے سیاسیات کو اس میں داخل ہو۔ بین الاقوامی وقار بڑھانے کے لیے اس نے شہنشاہ بزنطینہ کی بہن اینا سے شادی کی آرزو کی۔ مگر ادھر سے انکار ہوا۔ شہنشاہ کو مرعوب کرنے کے لیے ولاڈی میر نے بزنطینہ کی ایک نو آبادی چرسونز واقع کریمیا کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ شہنشاہ نے نیا اعتراض یہ کیا کہ وہ اپنی ہمشیرہ کو ایک بت پرست کے ساتھ نہیں بیاہ سکتا۔ ولاڈی میر نے چرسونز کے یونانی کلیسا کے پادری کے ہاتھ سے بپتسمہ کرا کر یہ عذر باطل کر دیا۔ اس پر شہزادی اینا کو اس کے ہاں بھیج دیا گیا۔ وہ اس کی زوجیت میں آگئی اور چرسونز کا شہر واپس کر دیا گیا۔

ولاڈی میر کا تبدیلِ مذہب ایک سیاسی چال سہی لیکن نتائج بڑے اہم اور دُور رس ہوئے۔ شہزادہ یونانی پادریوں کو ہمراہ لے کر کیف آیا۔ شہر کے تمام لوگ نیپر کے کنارے پانی میں کھڑے ہو گئے اور انہیں بپتسمہ دیا گیا۔ پرانے چوبی بت دریا میں پھینک دیے گئے۔ اور ان مقامات پر جہاں وہ نصب تھے گرجا تعمیر ہوئے۔ پھر ایسی ہی تقریبیں روس کی دوسری ریاستوں میں منائی گئیں۔ اس طرح ۸۹ - ۹۸۸ء میں عیسائیت روس کا سرکاری مذہب بن گیا۔ ۷۹

ابتدا میں تو یہ نیا مذہب روسیوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ ملک کے دور دراز گوشوں میں کچھ مدت تک صنم پرستی کے قدیم اوہام اور رسوم چلتی رہیں۔ مگر یہ کیفیت دیر تک نہ رہی۔ بہت جلد روسی جوش و ولولے کے ساتھ اپنے نئے مذہب کے معتقد ہو گئے اور صدیوں تک یقینِ محکم نے انہیں ہر آفت کو استحکام اور شجاعت سے برداشت کرنے کی قوت بخشی۔ میدانِ جنگ میں جان دیتے ہوئے یا برفانی طوفانوں میں منجمد ہوتے ہوئے بھی انہوں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارے نہ سمجھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور وہ اس کی بارگاہ میں داخل کیے جائیں گے۔

اس وقت یورپ کے سب ممالک میں کلیسا ہی تمام علوم وفنون کا منبع تھا۔
راہب یا پادری کے لیے جس کا کام انجیل کی ترجمانی تھی خواندہ ہونا لازم تھا۔
اس لیے بالخصوص راہب ہی معلّم، مؤرخ، معمار، نقاش اور مہندس تھے۔ یہ
یونانی پادری ہی تھے جنھوں نے یہ علم اپنے روسی بھائیوں کو دیا۔ پہلے تو انھوں نے
روسیوں کو ایسے حروفِ ابجد سکھائے جن کے استعمال سے وہ اپنی زبان کو لکھ سکیں۔
یہ ابجد چند سال قبل سائرل راہب نے بلغاریوں کو انجیل پڑھانے کے لیے تجویز کیا تھا
مگر حسنِ اتفاق سے یہ روسی زبان کی ضروریات پورا کرنے کے لیے بھی کافی ہوا۔ اس
۷۹ طرح روسی خواندہ ہو گئے۔ یہی سائرل والی ابجد اس ملک میں اب بھی رائج ہے۔ اہلِ
یونان کیف میں انجیل، مقدس تقریباتِ عبادت اور بہت سی مذہبی کتب کے قدیم سلاوانی
(یا قدیم بلغاری) ترجمے بھی لائے جن کا سمجھنا روسیوں کے لیے بہت آسان تھا۔

پورے روس میں ہر جگہ کلیساؤں اور خانقاہوں کا جال بچھ گیا اور ان سے
مملکت کے دور افتادہ علاقوں میں بھی چپّے چپّے پر علم، روشن دماغی اور خوش
اخلاقی کی روشنی پھیل گئی۔ یوں عیسائیت نے روس میں تعلیمی کردار ادا کیا یونانیوں
نے روسی راہبوں کو فنونِ تعمیر اور آئیکن نقّاشی سے بھی آشنا کیا۔ آئیکن سے مراد
۸۰ مذہبی کتب میں مذکورہ روحانی پیشواؤں اور مناظر کو چوبی تختوں پر نقش کرنا ہے۔
روسی اس فن میں بڑی صلاحیت کے شاگرد ثابت ہوئے اور بہت جلد اپنے اساتذہ
پر بھی سبقت لے گئے۔ بزنطینی نمونوں سے ہٹ کر انھوں نے اپنی اختراع کے شاندار
طرزِ تعمیر کی بنا ڈالی اور ان کے بنائے ہوئے کلیساؤں کی آج بھی دنیا مدّاح ہے۔
بہت سے قدیم روسی آئیکن نقش ونگار دورِ حاضرہ کے فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ ترین
نمونے ہیں۔

کیف کی بین الاقوامی تجارت اور عیسائیت کے اثر سے روس کی رفتارِ ترقی بڑی

تیز ہوگئی جس کا احساس بالخصوص ولاڈی میر کے بیٹے عظیم ڈیوک یارو سلاف کے زمانۂ حکومت ۱۰۱۶ء - ۵۴ء میں ہوا۔

ضرورت کے وقت یارو سلاف بہت ماہر جنگجو بھی ثابت ہوتا۔ وقتاً فوقتاً اس نے پیچی نیگوں کو ایسی فاش ہزیمتیں دیں کہ انھوں نے پھر کبھی بزنطینہ جانے والے روسی قافلوں کو پریشان نہ کیا۔ وہ ایک مخلص مسیحی، ایک اعلیٰ مدبّر اور روشن دماغ شخص تھا۔ وہ یورپ کے تمام حکمرانوں میں نام آور اور معزز تھا بعضوں کے ساتھ اس کے خاندانی رشتے ناتے تھے۔ اس کی زوجہ آرین شاہ سویڈن کی بیٹی اس کے ایک بیٹے کی شادی شہنشاہ بزنطینہ کی چچیری بہن سے ہوئی تھی۔ اس کی تین بیٹیاں شاہانِ فرانس، ہنگری اور ناروے کے عقد میں تھیں۔

کیف اب ایک عظیم، متمول اور خوبصورت شہر بن گیا تھا اور یارو سلاف نے بھی اسے مزین کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں بڑے بڑے سنگین کلیساؤں کی تعمیر سے دارالحکومت کو زینت دی گئی۔ سینٹ سوفیہ کتھیڈرل آج بھی اپنے وس سر بہ فلک گنبد اٹھائے کھڑا ہے۔ یارو سلاف کو کتب بینی کا بھی بڑا شوق تھا۔ یونانی سے بہت سے ترجمے خاص اس کے لیے کیے گئے۔ مختلف سلاوانی زبانوں کی کتابیں اس کے کتب خانے کے خریدی گئیں۔ مگر یہ ذوقِ علم اسی کی ذات تک محدود نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی رعایا بھی پڑھنے کا شوق رکھے۔ اس لیے سینٹ صوفیہ کی بیرونی عمارت میں کتب خانہ قائم کیا گیا اور سب لوگوں کو اس سے استفادے کا اذنِ عام ملا۔ یہ روس میں پہلا عوامی کتب خانہ تھا۔ علاوہ

۸۱ بریں چوبیس مدرسے کیف میں خود یارو سلاف کی زیرِ نگرانی جاری تھے۔ اس نے ملک کے لیے ایک کتاب قوانین بعنوان "روسی انصاف" تیار کی۔ بت پرستی کے دَور میں چوروں کے ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے اور قاتلوں کی تکہ بوٹی اڑا

دی جاتی تھی ۔ یارو سلاف کا رائج کردہ قانون زیادہ تر جرمانوں کی سزائیں دیتا تھا۔

اب روس میں امراء کا ایک خاص طبقہ بن گیا تھا جو بوُیر کہلاتے تھے ۔ یہ عظیم ڈیوک کے حکام یا جنگی سورماؤں اور اعلیٰ سیاسی مدبّرین پر مشتمل تھا۔ جو ملک کے چیدہ خاندانوں کے افراد تھے ۔ شہزادوں اور امراء کی بعض جاگیروں کی اراضی پر غلام کام کرتے تھے جو دراصل جنگی قیدی ہوتے تھے یا وہ لوگ جو مقروض ہونے کی وجہ سے آزادی کھو بیٹھتے تھے ۔ مگر روسی کسانوں کی اکثریت آزاد رہی۔ یارو سلاف کے تعلقات اپنی رعایا کے ساتھ سیدھے سادے اور جمہوری رجحان کے تھے ۔ اس کا محل مناسب گنجائش کا ایک مکان تھا جس کی ڈیوڑھی اور کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر نقش ونگار اور آرائش تھی ۔ باہر ایک طرف سبزیوں کا کھیت تھا اور باقی اطراف میں اصطبل ، ملازمین کے گھر اور مزرعہ کی ضروریات کے مکان تھے ۔ ہر شخص اپنی حاجت یا شکایت لے کر بلا رکاوٹ ڈیوک کے پاس جا سکتا تھا بعض موقعوں پر محل کے صحن میں آنے والے اشخاص کی کھانے پینے سے تواضع کی جاتی ۔ عظیم ڈیوک اور بویار امراء مشروب سے بھری ہوئی روپہلی صراحیاں ہاتھوں میں لیے ڈیوڑھی میں بیٹھ جاتے تھے ۔ دن رقص و سرود اور کھیل تماشے میں گزرتا اور عظیم ڈیوک موسیقی کی تال کے ساتھ تالیاں بجاتا رہتا ۔

روس کا تاریخی آغاز بڑا شاندار تھا ۔ دو صدیوں سے کم عرصے میں ریاست کیف نے بڑے کارنامے انجام دیے اور بامِ ترقی پر پہنچی ۔ مگر اس کا تنزل بھی اتنا ہی شدید ہوا ۔

جب تک ریورک کے اخلاف کی تعداد محدود رہی کیف کے عظیم ڈیوک کو ماتحت
ریاستوں میں اپنے قرابت داروں پر حکم چلانا آسان تھا ۔ مگر وقت کے ساتھ خاندان
۸۲ بڑھ گیا اور روسی علاقے کے وسیع ہونے سے ماتحت ریاستوں کی تعداد بڑھ گئی اور بعض
ازقسم نووگراڈ ، سمولینسک ، چیرنگاف اور گالیچ بہت بڑی اور طاقتور بھی ہوگئیں۔

اس لیے ماتحت شہزادے عظیم ڈیوک کی اطاعت سے روگردانی کرنے لگے۔ بعض اوقات وہ اس کے تختِ کیف کا وارث ہونے سے بھی انکار کردیتے اور سازشوں میں شریک ہوکر بغاوتیں برپا کردیتے۔ خود یاروسلاف کو کیف پر محکم حکومت قائم کرنے کے لیے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ جنگ آزما ہونا پڑا تھا۔ ان حالات میں روس کبھی تو مرکزی حکومت کے خلاف ماتحت ریاستوں کی گروہ بندی اور کبھی ان ریاستوں کی باہمی خانہ جنگی سے انتشار کا شکار ہوتا رہا اور اس طرح واقعات نے ملک کو مجموعی طور پر کمزور کردیا۔

یاروسلاف کی وفات کے ذرا بعد ایشیا نے یورپی روس کے جنوبی گیاہستان میں انسانوں کا ایک نیا وحشی گروہ دھکیل دیا۔ یہ کُمن تھے اور قدیم پیچی نیگوں کی نسبت زیادہ طاقتور اور ہیبت ناک تھے۔ ان کے دستوں نے جو بیشتر اسپ سوار تھے بڑی بے باکی کے ساتھ کیف، چیرنگاف اور پیریا سلاوی کے شہروں اور دیہات پر متواتر حملے کئے۔ انہیں لُوٹا جلایا اور باشندوں کو پکڑ کر لے گئے۔

اگر روس یاروسلافی عہد کی طرح متحد ہوتا تو وہ ان ایشیائی حملہ آوروں کے مقابلے میں پورا اترتا۔ مگر وہ تو ٹکڑوں میں بٹ کر کمزور ہو چکا تھا۔ بعض اوقات چند ریاستیں کُمنوں کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے اتحاد کرلیتیں مگر حملہ آور زیادہ جمعیت اور طاقت کی بدولت روسیوں کو ہرا دیتے۔ اتفاقیہ اگر کبھی روسیوں کو فتح میسر آبھی جاتی تو چنداں مفید ثابت نہ ہوتی وجہ یہ تھی کہ مغلوب ہونے پر فریب کار کُمن فوراً منتشر ہوکر بھاگ جاتے اور چند ماہ کے بعد واپس آکر روسی شہروں کو پھر اپنی زد میں لے لیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کُمنوں کی وبا مستقل ہوگئی ہے۔ ۱۰۷۱ء سے ۱۲۱۰ء تک ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں کُمنوں نے پچاس بڑی اور لاتعداد چھوٹی یورشیں جنوبی روس کی ریاستوں پر کیں ان حملہ آوروں نے بزنطینہ کے ساتھ روس کی تجارت مکمل طور پر تباہ کردی۔ اگر روسی قافلے کبھی کبھار منزل مقصود پر

پہنچ بھی جاتے تو بڑی جان جوکھوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد۔

اس طرح حملہ آوروں کے ہاتھوں بیرونی تجارت کے بڑے حصّے سے محروم ہوکر اور خون کی ندیاں بہ جانے سے کیف کی خوشحال اور شاداب ریاست تنزّل سے دوچار ہوئی۔ ایک مدّت تک وہ عظیم ڈیوک کی راج دھانی ضرور رہی مگر اس کی اور چیرنگاف اور دوسرے جنوبی مرکزوں کی آبادی بہت کم ہوگئی۔ لوگ بے کاری کا شکار ہو گئے اور ان کے پاس کوئی پیشہ اور شغل نہ رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں کیف کی یہ حالت تھی کہ وہ روسی قومی زندگی کی بے مثال مرکزیت کا درجہ کھوچکا تھا۔ ۸۳

امراء تاجر اور کسان کیف سے تین طرف کو منتقل ہوئے۔ کچھ تو انتہائی مغرب میں گمنوں کے حملوں کی زد سے دور کوہ کارپیتھین کے دامن میں واقع والہینیا اور گالیچ کی ریاستوں میں چلے گئے۔ کچھ ایسی ہی محفوظ ریاست نووگراڈ میں پہنچے اور باقی ماندہ جو اکثریت میں تھے شمال مشرق کی جانب دریائے والگا اور اوکا کے ساتھ ساتھ مرکزی روس کے جنگلات میں جاکر نوآبادکار بنے۔

اوّلین روسی بنیاد کار دستوں نے ایک سو پچاس سال پہلے اس علاقے میں داخل ہوکر، سُزڈال، روستاف، اور ولاڈی میر کے چھوٹے چھوٹے شہروں کی بنا ڈالی تھی۔ مگر سرسبز و شاداب کیف کے مقابلے میں یہاں کی زمین کم زرخیز اور آب و ہوا زیادہ سخت تھی۔ اس لیے جب تک کیف اپنے اوج پر رہا سُزڈال کی ریاست روس میں کسی کی نگاہ میں نہ جچتی تھی۔ ریورک کے اخلاف میں سے سب سے کم عمر شہزادے یوری ڈالگروکی کو یہ علاقہ مل گیا اور اس نے ۱۱۴۷ء میں یہاں ایک اور شہر ماسکو کی بنیاد ڈالی۔ یوری اور اس کا بیٹا اینڈریو دونوں بڑے ہوشمند حاکم ثابت ہوئے۔ انہوں نے نئی سڑکیں بنائیں اور نئے دیہات آباد کیے جنگل کاٹ کر کھیت بنائے اور ملک کی اصلاح و بہبود اور ترقی کا ہر ممکن انتظام کیا۔ یوری

کے جانشینوں کے عہد میں وسعت پذیر ریاست سُزڈال چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اور جب کیف سے انتقالِ آبادی شروع ہوا تو ان ریاستوں کے حکمرانوں نے پناگزینوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور آباد کار بڑھنا ورغبت مائل ہوگئے کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ مرکزی روس کے یہ علاقے گھنے جنگلات کے حاشیے کی بدولت کمنوں کے حملوں سے محفوظ تر تھے۔

ان وجوہ سے روس کی تاریخ نے جو بڑی عظمت وشوکت سے شروع ہوکر کیف میں بڑی بے دردی سے تباہ کردی گئی، اس مقام سے ایک نیا باب شروع کیا۔

۸۴ یہ نیا آغاز رجعتی اور انحطاطی تھا کیونکہ ابتداء میں مرکزی روس۔ اس کیف کے مقابلے میں جو وسیع تجارت، اعلیٰ پیمانے کے بین الاقوامی تعلقات اور تہذیب کا حامل تھا۔ یقیناً مفلوک الحال اور غریب تھا۔ یہاں زندگی کی جدوجہد بڑی شدید تھی اور اس نے روسیوں کو بڑا سنگدل اور جابر بنا دیا۔ نئے ملک میں انھوں نے تہذیب اور اخلاق کا وہ سبق جو یارو سلاف کے زمانے میں سیکھا تھا بھلا دیا۔ البتہ وہ بڑے محنتی رہے اور ان کے شہر ولاڈی میر، روستاف، اور ماسکو نشوونما پاتے رہے اور رفتہ رفتہ بڑی ترقی کر گئے۔ اوّلین حوصلہ افزا تجارتی تعلقات دریائے والگا کے راستے ایشیائی اقوام کے ساتھ قائم ہوئے۔ جنگلات کاٹ کر صاف کیے رقبوں میں تویر، کاستروما اور ریازان کے شہر اور ریاستیں آباد ہوگئیں۔

مگر اب ایک اور بہت بڑی آفت نازل ہوئی۔ ۱۲۱۵ء تک عظیم منگول فاتح چنگیز خان نے شمالی چین پر مکمل قبضہ کرلیا ۲۰ - ۱۲۱۸ء کے درمیان چاروں طرف غارتگری اور دہشت پھیلاتے ہوئے اس نے افغانستان اور مرکزی ایشیا کے باشندوں کو جوروستم سے پامال کیا اور سمرقند پر مسلّط ہوگیا۔ پھر جلد ہی محض ذاتی اغراض کے پیشِ نظر اس نے کمنوں کو سزا دینے کی ٹھانی۔ حیرت انگیز سرعت

کے ساتھ اس کی فوجیں قفقاز سے گزر کر جنوبی روس کے گیاہستان میں پہنچیں اور کمنوں
کو پے در پے لرزہ خیز شکستیں دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوف و ہراس سے مغلوب ہو کر کمن
سرداروں نے اپنے پرانے دشمن روسی شہزادوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے امداد کی
بھیک مانگی۔ اب تک روسیوں کو تاتاریوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا (چنگیز خان کی بے پناہ فوج
میں منگولوں کے علاوہ بہت سے تاتاری، کرغیزی، اوزبکی اور مرکزی ایشیا کے دوسرے
ترک بھی تھے) اب روسی شہزادوں کو ایک بڑے خطرے کا احساس ہوا۔ انھوں نے خیال
کیا کہ اگر نئے حملہ آوروں کی مدافعت نہ کی گئی تو کمنوں سے کہیں زیادہ خطرناک دشمن ان
کے دروازے پر دستک دے گا۔ اس بنا پر کیف، چیرنگاف، اور گالیچ کے شہزادوں
نے فوراً فوجیں بھرتی کیں اور دریائے ڈان کے گیاہستانی میدان میں دشمن کے مقابلے
میں صف آراء ہو گئے۔ چنگیز خان کے لشکر سے ان کی مڈبھیڑ دریائے کالکا کے کنارے ۸۵
ہوئی وہ جان توڑ کر لڑے مگر جنگ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ روسی اور ان کے کمن
حلیفوں کا صفایا ہو گیا۔ زخمی روسی شہزادے گرفتار ہو گئے اور انھیں اذیت ناک سزاؤں
سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ سانحہ ۱۲۲۳ء کا ہے۔ مگر طوفانی فتح حاصل کرتے ہی چنگیز
خان دفعتہً مرکزی ایشیا کی جانب مڑا اور جس سرعت سے نمودار ہوا تھا اسی طرح
اوجھل ہو گیا۔

غمناک اور ہراساں روسیوں کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ مگر یہ کیفیت دیر تک نہ رہی۔

چنگیز خان روسی گیاہستان پر ظہور کے بعد جلد ہی مر گیا۔ مگر منگول سرداروں کی مجلس شوریٰ نے اس کے پوتے خان باتو کو پورے یورپی روس کے میدان کو فتح کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ زرد چہرہ جس پر کبھی مسکراہٹ نہ آئی تھی، تنگ ترچھی آنکھوں اور جھکی ہوئی مونچھوں والا باتو اپنے دادا کی طرح ایک تیز، طرار، جنگی ماہر اور منصوبہ باز

شخص تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے ایک لاکھ پچاس ہزار فوج (جو اس زمانے کے لحاظ سے بڑی تعداد تھی)، تربیت دے کر تیار کی۔ اس نے اپنے دادا کے فنِ حرب کو مزید ترقی دی۔ روسیوں کو اس کی یہ جدت خاص طور پر قابلِ توجہ معلوم ہوئی کہ باتو کی تمام فوج گھڑ سوار تھی۔ روس اور مغربی یورپی ممالک میں اس وقت اس شان و شکوہ کے لیے کافی گھوڑے نہ تھے۔ اس لیے بالعموم امراء ہی گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑتے تھے اور ان کی فوج پا پیادہ ہوتی تھی۔ اس طرح باتو کو اپنی نقل و حرکت میں سبک روی اور پھُرتیلے پن کی وجہ سے فائدہ رہتا تھا۔ وہ صف آرائی میں فوجی حکمتوں سے ہمیشہ اپنے دشمنوں پر سبقت لے جاتا تھا اور وہ ایسی مہمیں ترتیب دے سکتا تھا جنہیں اس زمانے کے لحاظ سے برق رفتار اور طوفانی یلغاریں کہنا چاہیے۔ چوبی شہروں کو سر کرنے کے لیے اس کی عظیم افواج یہ چال چلتیں کہ تیل سے بھرے ہوئے مٹی کے ظروف آتش گیر مادے کی نلیاں لگا کر ان پر پھینک دیے جاتے جس سے ہر طرف شعلے بھڑک اٹھتے۔

اس طرح ۱۲۳۷ء میں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ باتو کے لشکر کے سیلِ رواں نے مغرب کی جانب ریازان کی چوبی فصیل کے سامنے نمودار ہو کر اطاعت اور
فدیے کا مطالبہ کیا۔ شہزادوں اور عوام نے نہ مانا اور مقابلہ کر کے دادِ شجاعت دی۔ ۸۶
مگر بہت جلد مغلوب ہو گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے ماسکو، ولاڈی میر، سُزڈال اور تویر نے مات کھائی اور دشمن نے سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ ولاڈی میر میں لاتعداد انسانوں کو موت کا شکار بنانے کے ساتھ تاتاریوں نے عظیم ڈیوک یُوری کے تمام خاندان کو بھی تہِ تیغ کر دیا۔ خود عظیم ڈیوک نے جو کچھ وقفے کے بعد اپنے رفیقوں کی فوج جمع کر کے باتو کے لشکر کا مقابلہ کرنے آیا ہزیمت پائی اور میدانِ جنگ میں مارا گیا۔

بعد کے دوسالوں میں خون کی ندیاں بہا کر، آگ اور غارت گری سے تباہی مچاکر اور لوگوں کو ہزاروں کی تعداد میں قیدی بنا کر باتو نے چیرنگاف، کیف، والھینیا اور گالیسیا فتح کر لیے۔ اس نے ہنگری تک میں جنگ کے شعلے بھڑکائے اور اسے خاک سیاہ کر دیا۔

یوں غارت گری کا سامان بن کر روسیوں کی تمام سرزمین منگول تاتاریوں کے قبضۂ اقتدار میں آگئی۔



"والگا کے ملاح" ریپین کی ایک تصویر سے ماخوذ

تاشقند کا ایک جدید حصہ



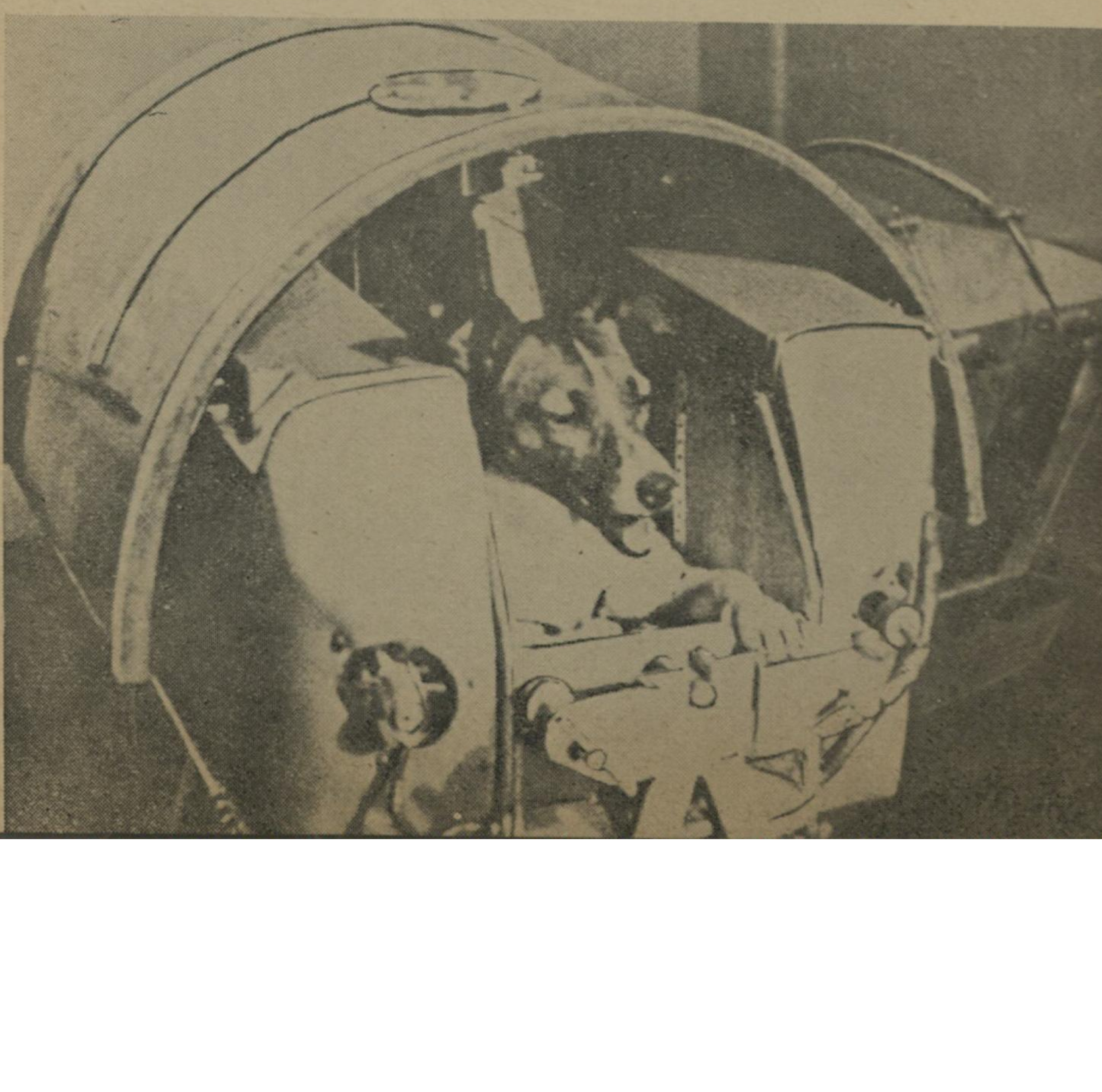


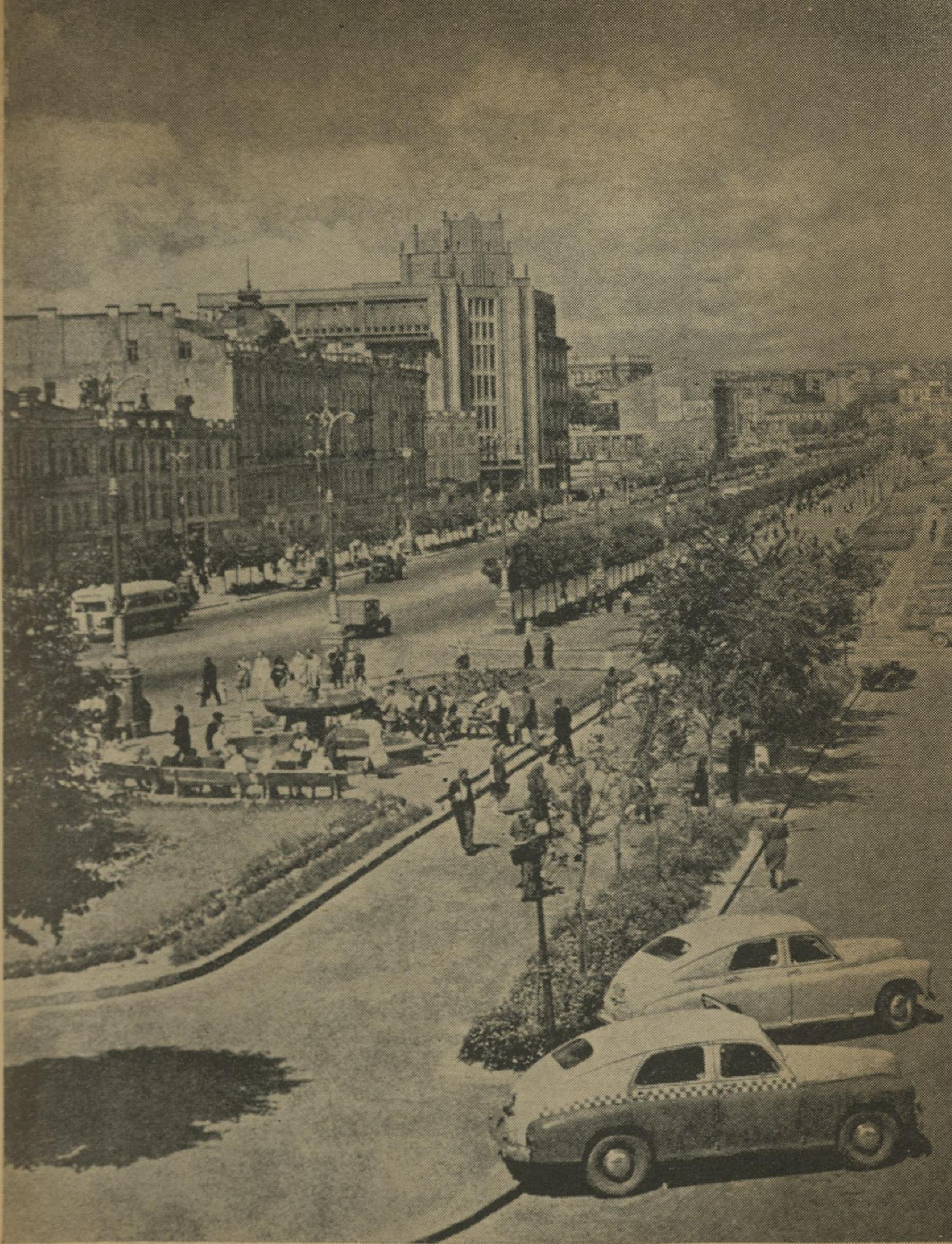
کیتھرائن عظمیٰ



ماسکو کے ایک اسکول میں کیمسٹری کا درس

لائیکا ایک سپٹنک میں سوار، خلائی سفر کے لیے تیار ہے





کیف کا بڑا بازار



بحیرۂ خزر کے قریب تیل کے کنوئیں

سُرخ چوک (ماسکو)

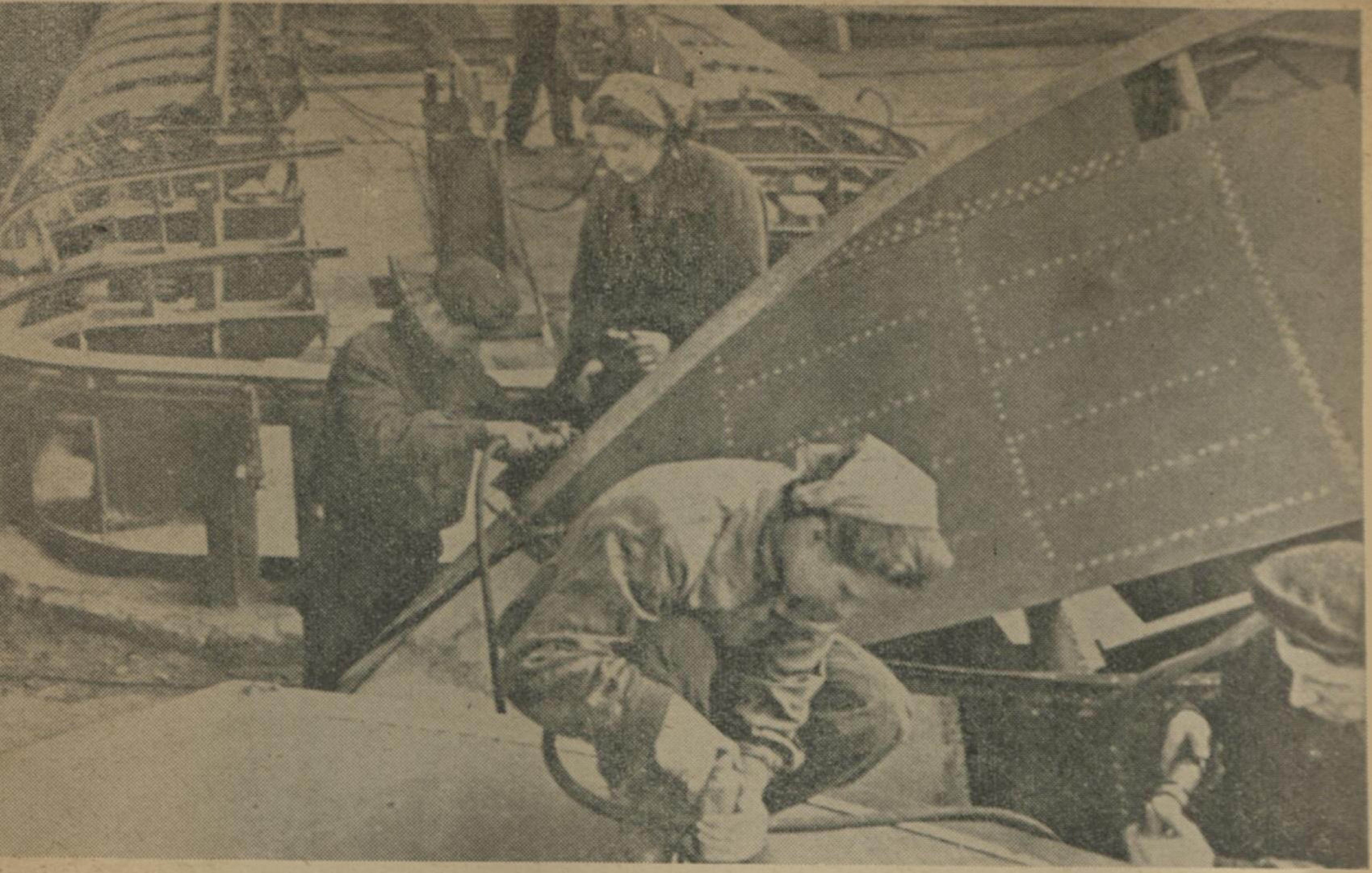




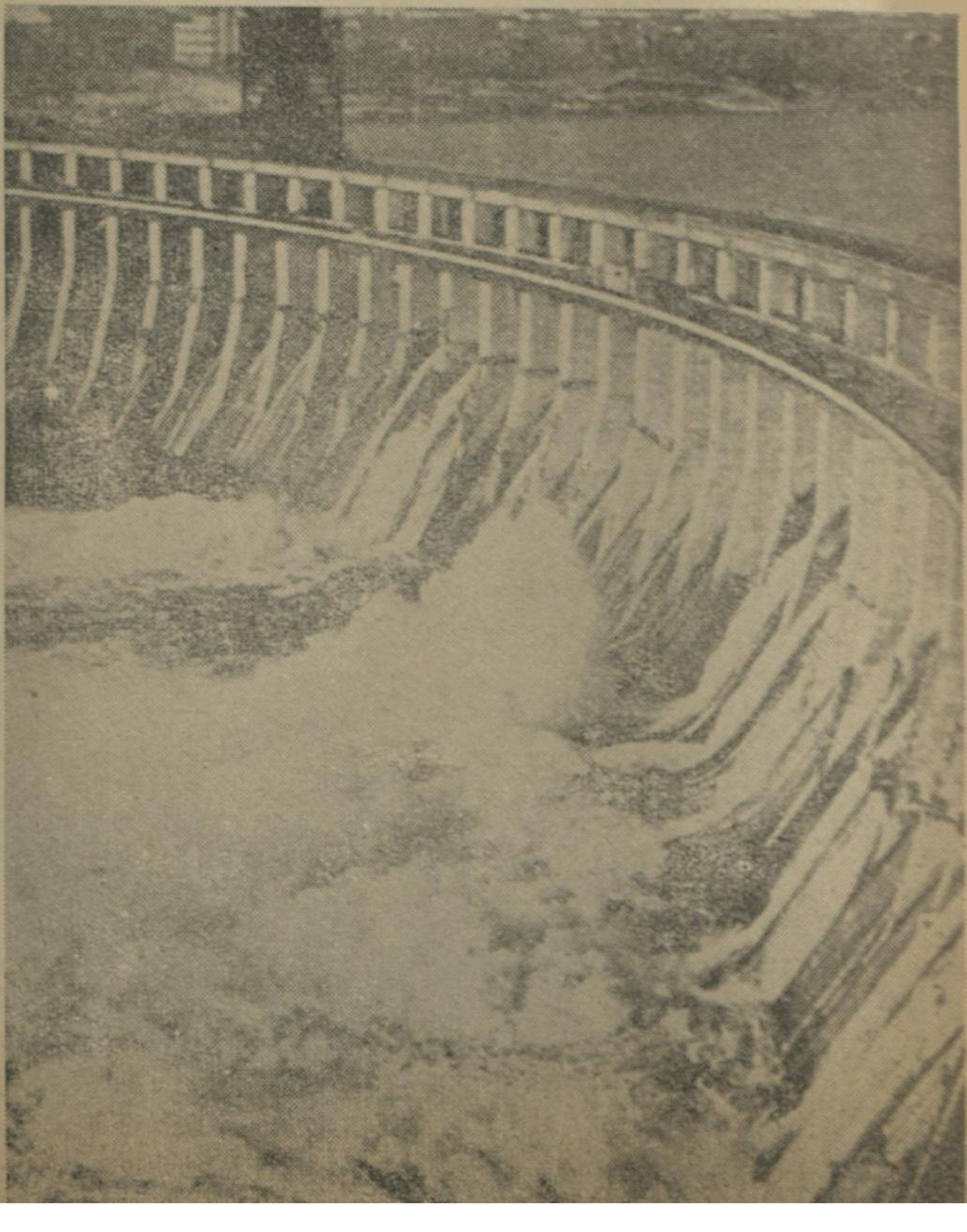
قفقاز کے کوہ کازبیک کا دامن



قفقاز میں ایک قدیم گاؤں



ہوائی جہازوں کا کارخانہ



زاپوروزہی کے مقام پر نیپر کا بند



وس کا عام دیہاتی منظر



تی بچے سکول سے گھر جا رہے ہیں

باب ۰ ۵

زار

روس اڑھائی سو سال تک تاتاریوں کے قبضے میں رہا اور ان میں کے پہلے سو سال بڑی سختی کے تھے۔

اپنی فتوحات کی تکمیل کے بعد خان باتو زیریں والگا کی طرف پھرا اور وہاں "اردوئے زرّیں" کے نام سے ایک ریاست قائم کی۔ ۴۰-۱۲۳۷ء کے قتلِ عام سے بچے ہوئے روسی حکمرانوں کو اس نے معزول نہیں کیا۔ اس کا مقصد اپنی سربراہی قائم کرنا تھا اس لیے اطاعت قبول کرنے والوں کو ان کی ریاستوں میں مختار رہنے دیا بلکہ فوجیں رکھنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس نے روسی کلیسا کو بھی بدستور برقرار رکھا۔ مگر وہ روس میں اپنے افسروں کی زیر قیادت فوجی دستے چھوڑ گیا جن کا کام ان والیانِ ریاست کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا اور اس ملک سے موعودہ سالانہ خراج وصول کرنا تھا۔

یہ خراج بہت بھاری تھا اور آغاز میں تو ادائیگی بالخصوص گراں ہوئی کیونکہ اس نے بیرونی حملوں سے برباد اور ستائے ہوئے ملک کے خون کا آخری قطرہ چوس لیا تھا۔ تاتاری حکام اور ان کے محافظ روسیوں سے بدسلوکی روا رکھتے اور انہیں ذلیل کرتے تھے۔ بعض شہروں میں تو لوگ اتنے تنگ آئے کہ ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں مار ڈالا۔ اس کے جواب میں "اردوئے زریں" سے بھاری افواج نے آکر لوگوں کو تہ تیغ کیا اور بڑی تعداد یرغمال کے طور پر پکڑ لے گئے۔

ان اوقات میں والیانِ ریاست نے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے تاتاریوں کا ساتھ دیا اور غیر منظم مدافعت کے روکنے اور خراج بڑھانے میں تاتاریوں کی مدد کی ۔ اگر ان اقدامات کے باوجود بلوے ہوتے تو یہ والیانِ ریاست بڑے انکسار کے ساتھ "اُردو" میں خانِ عالی کی خوشنودی حاصل کرنے کو پہنچتے ۔ لیکن درحقیقت سبھی ان ناہنجار کافروں سے نفرت کرتے تھے یہ غلامی اہلِ روس کی غیرتِ قومی کے لیے ناقابلِ برداشت توہین تھی اور وہ اخلاقی تنزل کے گڑھوں میں زندگی بسر کر رہے تھے ۔

روس کی شمال مغربی اور مغربی ریاستوں میں تاتاری اقتدار کا جوا نہ تو اتنا اذیت ناک تھا اور نہ دیرپا ۔ وہ حملہ آوروں کی زد سے دُور واقع ہوئی تھیں مگر
۸۸ ان علاقوں پر کئی اور مصائب نازل ہوئے تیرھویں صدی میں اہلِ سویڈن نے فن لینڈ کے راستے سے نووگراڈ کے اُوپر بحیرۂ بالٹک کے ساحل تک اپنے علاقے کی توسیع کر لی جرمن بھی مغرب کی طرف سے داخل ہو کر اسی کنارے پر آن جمے ۔ نووگراڈ کو دونوں سے سخت خطرہ لاحق ہوا ۔ جرمنوں نے تو اس کا بہت سا علاقہ بھی اپنے قبضے میں کر لیا جنوب کی طرف دریائے نیمن کے کنارے بسنے والے لتھونی قبیلے جو پہلے وحشی اور منتشر تھے اب متفق ہو گئے اور باہمی اتحاد سے انھوں نے ایک وسیع اور مضبوط ریاست حکومت لتھونیا کے نام سے بنالی ۔ تاتاری اقتدار میں روسیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لتھونیا کے رئیسوں نے مغرب کی جانب سے روس پر حملہ کر دیا ۔ سمالینسک کی ریاست جلد ان کے ہاتھ لگ گئی اور ۱۳۴۰ء میں کیف اور والہینیا بھی لے لیا گیا ۔ گالیچ پولستانیوں کے قبضے میں آگیا ۔ ان علاقوں کے باشندوں نے لتھونیوں کا اقتدار بے چون و چرا قبول کر لیا کیونکہ وہ اسے تاتاریوں کے غلبے پر ترجیح دیتے تھے ۔ لیکن اس سے روس ٹکڑوں میں بٹ گیا جو مستقبل میں ان کے لیے بڑی پشیمانی کا باعث ہوا ۔

پھر بھی روس کا متعد بہ حصہ تاتاریوں کا مقبوضہ رہا۔ تقسیم در تقسیم مرکزی روس کی ریاستیں محدود ہوتی گئیں۔ ان کے والی آپس میں جھگڑتے رہتے اور بعض اوقات میدان کارزار میں صف آرائی کی نوبت آجاتی۔ تاتاری حملے سے پہلے ہی وہ یہ قدم اٹھا چکے تھے کہ ڈیوک کی راج دھانی کیف سے مرکزی روس کے سب سے بڑے شہر ولاڈی میر میں منتقل کرادی۔ پھر ایک اور چکر چلا کبھی ایک کبھی دوسرا والی ولاڈی میر پر غلبہ پاکر عظیم ڈیوک بن جاتا۔ لیکن اس لقب کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی تھی اور چھوٹے چھوٹے والی عظیم ڈیوک کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ متحدہ روس کا جذبہ جو کیف کے زرّیں عہد میں بڑے زوروں پر کار فرما تھا اب مدّہم پڑ چکا تھا۔ صرف کلیسا ہی روسیوں کی اخلاقی پشت و پناہ بنا رہا اور انھیں ایک قوم ہونے کا سبق یاد دلاتا رہا۔

مگر یہ تاریک دور دیر پا نہ ہوا اور ماسکو نے ایک طاقت بن کر روسیوں کو قعرِ مذلّت سے نکالا۔

دو اہم دریاؤں کی گزرگاہ پر ماسکو کے محل وقوع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس آبی راستے کی بدولت تجارت کو اتنا فروغ ہوا کہ ڈیوک یوری ڈالگوروکی کے اخلاف
جو مسلسل ریاست ماسکو کے والی رہے تمام دوسرے روسی والیوں سے بڑھ چڑھ کر ۸۹
امیر کبیر بن گئے۔ پھر ماسکو کی دولت و ثروت کی کشش سے امراء اور کسان دوسری ریاستوں سے نکل نکل کر اس میں آ بسے اور آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ ماسکو کے حکمران اپنے ہمسایوں سے کہیں زیادہ بڑی فوج ملازم رکھنے کے اہل تھے۔ اس سے انھوں نے ساتھ کے حکمرانوں کے علاقے اور شہر چھین کر اپنی ریاست وسیع کرلی پھر ولاڈی میر پر ان کا مستقل قبضہ ہو گیا اور وہ عظیم ڈیوک کا درجہ حاصل کر گئے۔ ۱۳۴۰ء کے لگ بھگ ان میں سے ایک ایسے ہی ڈیوک ایوان کالتا نامی نے تاتاری خان کو

آمادہ کر کے "اُردوئے زرّیں" کے لیے روس سے خراج جمع کرنے کی ذمہ داری لے لی اس سے روس کے خانگی معاملات میں تاتاریوں کی مداخلت کے مواقع کم ہوگئے اور ان کا غلبہ بھی شدت کا نہ رہا۔ تمام روسی کالِٹا کو تشکّر آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے اور ماسکو کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔

چودھویں صدی کا نصف گزرنے کے بعد "اُردوئے زرّیں" باطنی خلفشار اور خانہ جنگیوں سے کمزور ہوگیا ایک تاتاری سردار مامے نامی ان سب کو دبا کر خان بن گیا پھر بھی اُردو کا طمطراق نہ رہا جو باتو کے عہد میں تھا۔ اس سے روسیوں کے حوصلے بڑھے اور وہ بعض اوقات اپنے ان آقاؤں کی مدافعت کرنے لگے۔ایک موقع پر کسی ظلم کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے چند ایک تاتاری بستیوں کو لوٹ کر جلا بھی دیا۔ مامے خاں کو احساس ہوا کہ روس پر اس کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہو چلی ہے۔ اس نے اسے بحال کرنے کی ٹھانی۔ ایک جرّار فوج لے کر وہ گیاہستان عبور کرتا ہوا ماسکو پر وار کرنے کے لیے ریازان کی طرف بڑھا۔

اس وقت عظیم ڈیوک ڈمٹری ماسکو کا حکمران تھا اس کی نگاہ دور رس اور قوت استقلال زبردست تھی تاتاری جُوئے سے گلو خلاصی بچپن سے ہی اس کی زندگی کا نصب العین تھا۔ مامے خاں کی حرکات و سکنات سے آگاہی پاتے ہی اس نے دوسرے روسی والیان ریاست سے مدد مانگی۔ گو جواب میں صرف چند ایک نے کمک بھیجی۔ اکثریت دور سے تماشا دیکھتی رہی مگر ڈمٹری کو تو ہر حال میں جنگ لڑنا تھی کیونکہ روس کا مستقبل اس سے وابستہ تھا۔ ماسکو کے قریب ٹرائٹسکی راہب خانے میں وہ بڑی دیر تک عبادت میں جھکا رہا اور روس کے معزز ترین راہب "باپ سرگوئی" نے اس کی مہم کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ وہ سوار ہو کر فوجوں کی قیادت کرتا نکلا۔ان افواج کے ساتھ جو تعداد میں خاصی تھیں مگر معرکہ خیز اور جرّار نہ تھیں وہ جنوب میں

گیاہستان کے جنگلی حصّے کی طرف اس غرض سے بڑھا کہ مامے خان کو اپنے حملے کی زد میں لاکر اسے روسی شہر اور قریات تاخت وتاراج کرنے سے روکے۔

روسیوں نے دشمن کو دریائے ڈان کی مشرقی جانب "کُلی کو دو میدان" کے علاقے میں صف آراء پایا تاتاری تیروں کے بادل اس طرح چھا گئے کہ سورج چھُپ گیا اور روسی صفوں میں رخنے پڑ گئے۔ پھر تاتاریوں نے زبردست حملہ کیا گھمسان کا رن پڑا۔ خون کی ندیوں کے درمیان جان سے ہاتھ دھو کر روسی جی توڑ کر لڑے۔ مگر مامے کی زبردست فوج کے سامنے کچھ بن نہ پڑا۔ بھاری نقصان سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے۔ خود ڈمیٹری گھوڑے سے گر کر لاشوں کے ڈھیر میں بے ہوش پڑا تھا۔ ہاں اس نے آغاز جنگ سے پہلے اپنے عم زاد بھائی کو ایک دستہ فوج دے کر گھات میں چھپا دیا تھا۔ اس لمحۂ یاس میں جب شکست صاف نظر آنے لگی، یہ دستہ کمیں گاہ سے نکل کر یکبارگی حملہ آور ہوا جس سے تاتاریوں کے چھکّے چھوٹ گئے۔ سراسیمگی اور انتشار کے عالم میں وہ میدان سے بھاگے اور بڑی تعداد میں تہِ تیغ ہوئے۔ روس کو مکمل فتح نصیب ہوئی۔ دشمن کے سامانِ جنگ اور اسلحہ کا وسیع ذخیرہ ان کے ہاتھ آیا۔ مامے خاں خود اپنے محافظوں کی مدد سے بہ مشکل جان بچا کر بھاگا۔ یہ واقعہ ۱۳۸۰ء کا ہے۔

ڈمیٹری مظفر و منصور ماسکو واپس ہوا۔ لوگوں نے مسرت کے آنسو بہا کر اور کلیساؤں کی گھنٹیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ مگر یہ سب خوشیاں عارضی تھیں۔ دو سال بعد مامے خاں کا جانشین توختہ مِش بھاری فوج لے کر اچانک ماسکو پر چڑھ آیا بے خبری میں دفعتہً حملے کی زد کا مقابلہ ناممکن پاکر ڈمیٹری شمال کی جانب پسپا ہوا۔ تاتاریوں نے ماسکو لوٹنے کے بعد اسے جلاکر راکھ کر دیا روسی مغلوب ہوکر تقریباً سو سال تک باج گزاری پر مجبور ہوئے۔ مگر ان حالات میں بھی جنگِ "کُلی کو دو" کی یاد

ان کی ڈھارس بندھاتی تھی ۔ خود اعتمادی کا جذبہ انہیں بتاتا تھا کہ تاتاری ناقابلِ تسخیر نہیں ۔ توختہ مش کی کامیابی کا راز اچانک حملے میں مضمر تھا ورنہ روسی اور تاتاری فوجیں برابر کی چوٹ تھیں ۔ تاتاریوں نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا اور روسیوں کے ساتھ ملائمت اور احترام کا سلوک کرنے لگے ۔ ڈمٹری کی فتح سے ماسکو کے عظیم ڈیوک اہلِ روس کی نگاہ میں بے مثال قائد بن گئے ۔ ڈمٹری کے جانشینوں نے تمام روسی ریاستوں کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت ماسکو کی قیادت میں ایک بڑی سلطنت بنانے کا نصب العین اپنے سامنے رکھا اور سو سال کے عرصے میں اسے تکمیل کو پہنچا دیا ۔ یہ اہم کام انہوں نے کہیں تو حکمت عملی اور باہمی رشتۂ ازدواج سے اور کہیں چھوٹی ریاستیں ان کے والیوں سے خرید کر کیا اور جہاں نوووگراڈ ، تویر اور روستاف جیسی ریاستوں کے زبردست والیوں نے برضا و رغبت ماسکو میں شمولیت سے انکار کیا ، انہیں بزور شمشیر زیر کیا ۔ ان اقدامات میں ہر عظیم ڈیوک کو روسی عوام کی تائید حاصل رہی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ان متفرق والیان ریاست کی نسبت ماسکو کی حکومت دشمنوں سے ان کی حفاظت کی زیادہ اہل تھی جو والیِ ماسکو کے خود بخود مطیع ہوگئے وہ اپنی سابق ریاستوں میں جاگیروں کے حسب معمول مالک رہے اور ان کے شاہی القاب بھی بحال رہے ۔ انہوں نے متعلقہ جاگیروں کی نسبت سے اپنے خاندانی نام شہزادگانِ "ویازمسکی"، "بیلوسلکی" اور "اوبولینسکی" وغیرہ رکھے یہ فرق ضرور پڑا کہ ان ریاستوں میں ان کی حیثیت والی کی نہیں بلکہ محض سربراہ کی تھی ۔ البتہ وہ ڈیوک کی ملازمت میں اس کے بویار (یعنی مدبرینِ اعلیٰ یا مشیرانِ زار) بن کر داخل ہوئے اور دوسرے حکام اور فوجی سرداروں کو زمرۂ امراء کا مخصوص جزو شمار کیا گیا ۔

عظیم ڈیوک آئوان سوم کے عہد میں منتشر روسی ریاستوں کو ایک مرکز پر لانے

کا کام مکمل ہوگیا۔ اپنی حکومت کے اختتام پر ۱۵۰۵ء میں آئوان ان تمام روسی علاقوں کا بھی واحد مالک بن گیا جو پہلے تاتاریوں کے قبضے میں تھے۔ اس کی نئی وسیع ولایت "عظیم ریاست مسکوویا" کے نام سے مشہور ہوئی۔ مملکتِ یارو سلاف کے پارہ پارہ ہونے کی بدولت کھویا ہوا اتحادِ روس چار سو سال کے بعد دوبارہ حاصل ہوا لیکن اب بھی اس کی جڑیں اچھی طرح مضبوط نہ تھیں کیونکہ مغرب میں بہت سی روسی آبادیاں یعنی کیف، سمولینسک، والینیا اب بھی روس سے علیحدہ بیرونی اقتدار بالخصوص لتھونیا کے زیرِ فرمان تھیں۔

آئوان سوم ایک زیرک سیاست دان، خود دار اور متکبّر شخص تھا۔ اسے اپنی مسکوویا کا واحد مالک ہونے کی حیثیت کا بڑا پندار تھا۔ اس کے عہد میں اطالوی اور روسی معماروں نے کریملن کے اندر حسین ترین محلّات تعمیر کیے۔ سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے بقیہ تاتاری اقتدار کے پرخچے اڑا دیے۔

اس وقت تک "اُردوئے زریں" اور بھی کمزور ہوگیا تھا۔ دریائے والگا کے زیریں حصّے میں استراخان کے نواحی علاقے پر تو ان کا قبضہ رہا مگر دو بڑے تاتاری گروہ ان سے علیحدہ ہو گئے۔ ایک نے تو وسطی حصّۂ دریائے والگا کے کنارے خاصی دور شمال کی جانب ایک خان کی سرکردگی میں کازان کی حکومت قائم کی اور دوسری ریاست کریمیا میں بنی۔ متحدہ مسکوویا پوری قوت سے اب تاتاریوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اپنے اس دور میں عظیم ڈیوک آئوان نے خان احمد کا مراسلہ زمین پر پٹک دیا۔ پھر اسے پاؤں سے مسل ڈالا اور نامہ بر سفیر کو دھکّے دے کر نکال دیا۔ ۱۴۸۰ء میں خان احمد فوج لے کر مسکوویا کی مشرقی حد پر آن پہنچا۔ ادھر سے آئوان ایک جرّار فوج کی کمان کرتا ہوا میدان جنگ میں اترا۔ دونوں حریف ایک چھوٹے سے دریا کے پار سے جو دونو فوجوں کے درمیان حائل تھا ایک

دوسرے کو تاکنے لگے ۔ خان احمد بغیر کسی جنگی اقدام کے خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے تاتاری کشمکش ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی اور مسکوویا آزاد ہوا ۔

تاتاری غلامی سے روس کی مکمل آزادی سے ذرا پہلے مشرقی روما کی سلطنت ایک اور ایشیائی قوم یعنی ترکوں کی زد سے مات کھاگئی تھی ۔

اس قوم نے مدتوں پہلے سلطنت رُوما کے مقبوضہ ایشیائے کوچک کو فتح کرلیا تھا بلکہ جزیرہ نمائے بلقان کے بھی بہت سے حصّے لے لیے تھے ۔ ۱۴۵۳ء میں انھوں نے اس کا عظیم الشان دارالحکومت بزنطینہ سر کرلیا ۔ اس کے آخری شہنشاہ کانسٹینٹائن پالیو لوگس نے محصورہ شہر میں لڑتے ہوئے دادِ شجاعت دی ۔ لیکن اس وقت مارا گیا ۔ جب حملہ آور فصیل میں شگاف کر کے سیلِ رواں کی طرح اندر داخل ہوئے چیخ پکار ، بہتے خون اور بھڑکتے شعلوں کے درمیان فاتح سلطان محمّد ثانی اسپ سوار سینٹ سوفیہ میں داخل ہوا اور اس کی دیوار پر اپنے خون آلودہ پنجے کا نقش ثبت کیا ۔

روسیوں کو انتہائی صدمہ پہنچا بزنطینہ سے انھیں مذہب کی روشنی ملی تھی اور اس وقت سے وہ اسے مشرقی کلیسا کا (چونکہ یہ اور مغربی یعنی رومن کیتھولک کلیسا مدتوں سے الگ ہو چکے تھے) روحانی سرچشمہ سمجھتے تھے ۔ عیسوی صلیب کی بجائے اسلامی ہلال کا سینٹ سوفیہ کے گنبد پر چمکنا انہیں سخت ناگوار ہوا اور ان کے دلوں پر خوف و ہراس غالب آیا ۔ مگر ساتھ ہی انہیں ایک نیا خیال سوجھا۔ روسی عوام اور بالخصوص راہبوں کو احساس ہوا کہ بزنطینی شہنشاہوں کے تنزّل کے بعد روسی فرماں روا اس خلا کو بھر سکتے ہیں اور مشعل تھام کر مشرقی کلیسا کی بگڑی بنانے والے ہو سکتے ہیں ۔ ایک بات یہ ہوئی کہ شہنشاہ کانسٹینٹائن پالیو لوگس کی بھتیجی شہزادی سوفیہ موت سے بچ کر روم پہنچ گئی تھی اور بعد میں ڈیوک آئوان سوم نے اسے اپنی

ملکہ بنایا تھا۔ بعض روسیوں کو اس میں نیک شگون نظر آیا۔ ان کی رائے میں سوفیہ کے ساتھ بازنطینی شاہنشاہوں کی روحانی قیادت اور تاجِ سلطانی بھی ماسکو اور اس کے حکمران خاندان میں منتقل ہو گئے۔

اس بنا پر جب ۱۵۴۷ء میں آئیوان سوم کا پوتا اور ہم نام آئیوان چہارم بلوغت کو پہنچا تو اس نے نہ صرف عظیم ڈیوک بلکہ زار (بازنطینی شہنشاہوں کو روسی لوگ زار کہتے تھے) ہونے کا اعلان کیا اور تاج شاہی پہنا۔ جشن تاجپوشی عظیم الشان بزنطینی رسم کے مطابق "معراجِ مریم" کے کلیسا واقع کریملن میں بھاری ہجوم کے سامنے بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ یہی شخص جو روس کا پہلا زار بنا بعد ازاں دنیا میں "دہشت ناک" آئیوان کے لقب سے مشہور ہوا۔ تاجپوشی بھی نری ظاہری رسم ہی نہ تھی۔ خود آئیوان نے اور شاہانہ تجمل کی ہیبت سے مبہوت عوام نے جن کے ہجوم سے کلیسا میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، گہری مذہبیت سے سرشار ہو کر اس جشن کو بڑی اہمیت دی۔ روس کو اس سے نئی عظمت ملی۔ اب سے اس کے نئے بادشاہ نے "ربانی مسیح" کا شرف پایا۔ بازنطینی شہنشاہوں کی طرح وہ بھی فضل الٰہی سے مطلق العنان فرماں روا بنا جو اپنے اعمالِ حسنہ یا شنیعہ کے لیے صرف خدائے قدیر کے سامنے جواب دہ تھا۔

ابتداء میں تو زار آئیوان قطعاً "دہشت ناک" نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ اپنے عہد کے نصف اول میں اپنی رعایا کی آنکھوں کا تارا اور نہایت ہردلعزیز تھا۔ آئیوان بلند قامت تھا۔ اس کی چھاتی چوڑی چکلی، چہرہ دُبلا، ریش دار، ناک محرابی، آنکھیں تیز اور نگاہیں کُھب جانے والی تھیں۔ وہ اپنے وقت کا بہترین تعلیم یافتہ اور علم کا دلدادہ شخص تھا۔

مادری زبان کے علاوہ وہ بڑی روانی سے یونانی، لاطینی، لتھونی اور پولستانی

وغیرہ سات زبانیں بول سکتا تھا۔ اس میں جبلّی تدبّر، قوی اور شاطر دماغ کی صلاحیتیں تھیں۔ سیاست میں وہ حیرت انگیز پیش بیں واقع ہوا تھا۔ بہت سی باتوں میں وہ پیٹرِاعظم کا پیشرو تھا۔ وہ ان تھک کارکن تھا اور اس کے دل میں اپنی رعایا کی بہبود کا پُر خلوص ولولہ موجزن تھا۔

کریملن میں اس کی رہائش بڑی شوکت و تمکنت کی تھی۔ وہ سرخ یا سیاہ مرصع زردوز کپڑے کے بغیر کسی کے سامنے نہ ہوتا تھا۔ ویسے ہر شخص کو اس تک رسائی تھی مسکوویا کا غریب سے غریب باشندہ اپنی عرضداشت براہِ راست پیش کر سکتا اور زار بڑی شفقت سے اس کی حاجت روائی کرتا۔ مسکوویا کا وہ پہلا حکمراں تھا جس نے ملک کی نمائندہ مجلس قائم کی۔ وہ مطلق العنان آمر ضرور تھا مگر اسے اپنی رعایا کی ضروریات جاننے اور ان کی خواہشات کو ملحوظ رکھنے کی زبردست آرزو تھی ۱۵۵۰ء کے اجلاس میں اسے دانشمندانہ اور اہم ملکی اصلاحات کا منصوبہ تیار کرنے میں اس مجلس مشاورت سے بڑی مدد ملی۔ مثلاً عدالتوں میں جہاں پہلے کاہلی اور رشوت ستانی رائج تھی منتخب جرگہ کا نظام رائج کرنے سے بڑی اصلاح ہوئی۔ ۱۵۶۶ء کے اجلاس میں لتھونیا کے خلاف ایک اہم جنگ جاری رکھنے کے مسئلے پر نمائندہ مجلس سے زار کو مفید مشورے ملے۔ دار وگیر، سولیوں اور دوسری اذیت ناک سزاؤں کے داغ سے اس کی حکومت کا نصف اوّل محفوظ رہا۔ پھر بھی آئوان کے
۹۵ ہر حکم کی کامل اطاعت کی جاتی تھی۔ لوگ اپنے بالوں کی حجامت نہ بنواتے اور ندامت سے سر جھکائے پھرتے جب تک وہ کسی وجہ سے ناراض زار کو مسکراتا نہ دیکھ لیتے۔

پھر آئوان کے مزاج میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ ۱۵۶۴ء میں تخت سے دست برداری کی دھمکی دے کر اس نے ماسکو کے شہریوں اور پادریوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اسے غدّاروں کو بغیر قانونی مقدمہ چلائے سزا دینے کا مختار بنائیں۔

یہ تقاضا سب نے فوراً مان لیا اور نتیجہ میں ایسی پکڑ دھکڑ اور دار ورسن کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ ماسکو کی آنکھ نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ جلّاد کے کلہاڑے سے سیکڑوں انسانی سر کٹ کٹ کر گرے۔ "سرخ چوک" سے گزرتے ہوئے دیوارِ کریملن کے "زاستناک" حصے کی تنگ و تاریک گہرائیوں سے لوگ روزانہ آہ وزاری اور چیخ پکار سنتے تھے۔ کیونکہ انہی کھوہوں میں آئوان کے تعجب خیز جذبۂ خون آشامی کے شکار بدنصیب انسانوں کو اذیت دی جاتی تھی۔ انہی وجوہ سے آئوان درحقیقت "وہشت ناک" بن گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کا پس منظر کیا تھا؟ عہدِ طفلی سے ہی آئوان تنگی مزاج تھا اور اس کی طبیعت میں بے رحمی کا عنصر غالب تھا۔ مگر کچھ مدّت تک اس نے ان جبلّی میلانات پر قابو رکھا جس کی ترغیب اس کی نہایت محبوب نرم دل، نوخیز ملکہ اناستاشیا سے ملی جو بویار رومناف خاندان کی امیر زادی تھی۔ اناستاشیا کی محض موجودگی ہی اس پر حیرت انگیز اثر ڈالتی اور اسے راحت وسکون بخشتی تھی مگر ۱۵۶۰ء میں یہ المیہ واقع ہوا کہ ملکہ عجیب وغریب، نامعلوم حالات میں انتقال کر گئی۔ آئوان کو کسی طرح قرار نہ تھا۔ اسے شک گزرا کہ اس کی محبوب رفیقۂ حیات کی موت دشمنوں کی زہر خورانی سے ہوئی ہے۔ اس شبہے نے اسے اپنے عمر بھر کے دوست بویار امراء سے بھی برگشتہ کر دیا اور ان کی جگہ نئے، بالکل گمنام، بے حیثیت اشخاص رفیق بن گئے۔ زار نے کثرتِ مے نوشی میں سکون ڈھونڈا۔ اس کی طول طویل عبادتوں اور روزوں کے تسلسل میں رخنے پڑ گئے۔ گو مذہبی دلدادگی کی بدولت اس نے ان مشاغل کو یک قلم ترک نہیں کیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے نئی شادیاں رچائیں مگر وہ جلد ہی اکتا جاتا اور بیویوں کو دور دراز کے راہب خانوں میں بھیج دیتا۔ اس کا سابقہ دبا ہوا جبلّی

جذبۂ ظلم اب عود کر آیا۔ اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ غصے کا جنون اس کے قابو سے باہر تھا۔ وہ اذیت ناک سزائیں اور پھانسی کے پھندے لگے دیکھ کر خوش ہوتا اور انسانیت کا درد و کرب اسے راحت پہنچاتا تھا۔ بعض لمحے ایسے بھی آتے جو اسے احساس دلاتے کہ وہ ایک ذلیل قسم کا گنہگار ہے اور اسے دردناک پشیمانی ہوتی مگر اپنے اوپر قابو رکھنے کی قوت اس میں باقی نہ رہی تھی۔

بایں ہمہ آئوان نہ خبطی تھا نہ مجنون۔ اس کی یہ تمام دار و گیر اور موت کی سزائیں ایک ضابطے میں تھیں۔ اس کا غصہ کبھی غریبوں مسکینوں پر نہ اترا۔ اس کی زد صرف حکومت کے بلند ترین طبقۂ امراء، شہزادگان اور ذی جاہ بویار روساء پر پڑتی تھی۔

آئوان کے اسلاف کے دور میں یہ لوگ بڑے اثر و رسوخ والے تھے۔ وہ عظیم ڈیوک کے ساتھ فی الواقع اختیارات میں برابر کے شریک تھے۔ تمام اہم معاملات میں مجلس امراء کے مشورے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس آئوان صاحبِ تاج و تخت زار کی حیثیت سے اپنے تئیں تمام طاقت اور اختیارات کا واحد مالک سمجھتا تھا کیونکہ خدائے بزرگ کے سامنے وہی اپنی رعایا کا جواب دہ تھا۔ اس بناء پر وہ بسا اوقات مجلسِ امرا کو نظر انداز کر دیتا اور عوامی نمائندوں کی رائے اور تائید کا طالب ہوتا۔ اس کے خیال میں امراء کی حیثیت ملازم یا مددگاروں سے زیادہ نہ تھی۔ یہ اندازِ فکر کئی امراء کی ناراضگی کا سبب ہوا۔ شہزادے بالخصوص محسوس کرتے کہ کبھی ان کے آبا و اجداد آزاد والیانِ ریاست تھے اور زار کے قرابت دار بھی تھے۔ ان کا شجرۂ نسب اس سے ملتا تھا۔ اس لیے ماسکو کے بعض رئیس خانوادوں میں زار کے خلاف بہت کچھ بے اطمینانی اور ناراضگی کا مظاہرہ ہوتا تھا۔

۱۵۶۴ء میں آئوان کے قابل ترین سپہ سالاروں میں سے ایک شہزادہ اینڈریو کربسکی نامی

اس سے جھگڑ پڑا ۔ وہ اس کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے لتھونیا بیں جو اس وقت ماسکو کے ساتھ برسرِ پیکار تھا چلا گیا اور وہاں کے ڈیوک کی ملازمت اختیار کرلی ۔ مزید برآں اس نے وہاں سے زار کو ایک خط لکھا جس میں امراء کے ساتھ غیر منصفانہ اور ظالمانہ سلوک کے خلاف بہت کچھ غم و غصے کا اظہار کیا ۔

کربسکی کے اس اقدام یعنی وطن دُشمنی سے آئوان کو سخت صدمہ پہنچا ۔ اس کے بعد وہ شہزادوں اور امراء پر جن سے وہ پہلے ہی متنفر تھا غداری اور سازشوں کا شبہہ کرنے لگا اور یہی وقت تھا جب اس نے ماسکو کے غداروں کو بغیر عدالتی چارہ جوئی کے سزائیں دینے کے اختیارات حاصل کیے ۔ کیوں کہ اس نے عمداً طبقۂ امراء کی سیاسی قوت و

۹۷ اقتدار کو مٹانے کے لیے قتل اور جلا وطنیوں کی مہم چلانے کا فیصلہ کیا ۔ یہی وہ وقت تھا جب خون کی ندیاں بہائی گیئں ۔

آئوان کے ظلم و ستم کی شکار انسانیت قریباً تمام کی تمام معصوم تھی ۔ بلکہ وہ لوگ بھی جو اس سے شاکی تھے کبھی غداری اور سازش کے مرتکب نہ ہوئے تھے ۔ ہاں یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ آئوان نے خوفناک جبر و تشدّد کا جو راستہ اختیار کیا اس سے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوا ۔

اس کے عہد کے آخر تک یہ نوبت ہوگئی کہ قدیم طبقۂ امراء یکسر خائف اور بے وقار ہو گیا ۔ اس کی طاقت پارہ پارہ ہوگئی اور دولت و ثروت بہت گھٹ گئی ۔ وہ خاندان جن پر آئوان کا قہر ٹوٹا وسطی مسکوویا میں وسیع جاگیریں رکھتے تھے ۔ ان کے قتل اور جلا وطنیوں کے بعد یہ جاگیریں حکومتِ زار نے لے لیں ۔ پھر ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے غریب اور کم حیثیت امراء کو عارضی طور پر دے دیں یہ ان کی تحویل میں اتنی مدت ہی رہ سکتی تھیں جب تک وہ حکومت کی خدمات بجا لائیں ۔ اس طریقے سے قدیم امراء کے گھرانوں کے بجائے بہت بڑی جماعت ان

ادنیٰ امراء یا شرفاء کی وجود میں آگئی جن پر آئوان اعتماد کرسکتا تھا۔ کیونکہ یہ نئے امرا زار کی حکومت میں حصّہ دار ہونے کا ولولہ نہ رکھتے تھے۔ وہ جتنی دولت و ثروت رکھنے کے مجاز ہوئے محض خدمت و ملازمت کا صلہ تھی۔ اس لیے وفاداری لازمی عنصر تھا اور یہی زار کا مقصد تھا۔

آئوان کی زندگی کے آخری سالوں میں اس کی خون آشامی تو کم ہوگئی مگر اس کی سنگدلی ستمگری اور بے پناہ غیظ و غضب ویسا ہی رہا۔ طبیعت کا یہ جنون اس کی زندگی کا بڑا بھاری المیہ تھا۔ زار اپنے منجھلے بیٹے زاریوچ آئوان کو بہت چاہتا تھا مگر ایک مرتبہ کسی بحث کے دوران میں مشتعل ہوکر اس نے اپنا نوکدار آہنی عصا جو ہر وقت ساتھ رکھتا تھا نوجوان شہزادے کے سر پر دے مارا۔ زاریوچ گر کر بے ہوش ہوگیا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور چند دنوں بعد وہ مرگیا۔ زار کو جب اپنے کیے کا احساس ہوا تو رنج و غم اور پشیمانی نے اس پر کرب کی کیفیت طاری کردی۔ مہینوں گزر گئے مگر اسے چین نہ آیا۔ راتوں کو بے خوابی کے عالم میں محل کے ارد گرد اس طرح گھومتا رہتا گویا وہ اس ہستی کو تلاش کر رہا ہے جسے اس نے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ۱۵۸۵ء میں چوّن سال کی عمر پاکر یہ بدنصیب ترین شخص زار آئوان دنیا سے غمناک رخصت ہوا۔

اپنے دورِ حکومت میں آئوان نے مطلق العنان بادشاہ کی اچھائی اور بُرائی کے دونوں رخ دکھا دیے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ ستم کیشی کے بدترین زمانے میں بھی رُوس کی بڑی اکثریت میں انتہائی ہردلعزیز رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ غربا اور مساکین پر کبھی سختی اور تعدّی نہ کرتا تھا۔ وہ اسے اپنا بہت بڑا مربی اور محافظ سمجھتے تھے جو انصاف کا بے پایاں سرچشمہ ہونے کی بدولت کسی وقت بھی حق رسی سے نہ ہٹتا تھا اور عظیم زار کی حیثیت سے کریملن میں شاہانہ تجمل اور جاہ و جلال کے باوصف ان پر رحم کھاتا اور حاجت روائی کرتا تھا۔ صدیوں تک وہ اپنے بے شمار گیتوں کے شاندار الفاظ سے اس کی شخصیت اور عہدِ حکومت کے گن گاتے رہے۔

آئوان کے آغازِ حکومت میں ''اُردوئے زرّیں'' کی بقیہ نشانیاں یعنی دریائے والگا کے ساحل پر واقع کازان اور استراخان کی تاتاری حکومتیں مسکوویا کے گوشت پوست میں کھُبے ہوئے تکلیف دہ کانٹوں کی طرح تھیں ۔ کیونکہ یہ ریاستیں ملک کے غیر محفوظ مشرقی حصّے پر بار بار حملہ آور ہوتی تھیں ۔ زار نے ان حکومتوں پر فوج کشی کی اور جلد ہی انھیں فتح کرلیا ۔ اس کی فوج نئے آتشیں اسلحہ سے مسلح دستوں اور توپوں (جن کے لیے بارود پہلے ہی موجود تھا) کی مدد سے بڑی طاقتور ثابت ہوئی ۔ آئوان نے گرفتار شدہ تاتاریوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا ۔ ان کے سردار عیسائیت قبول کرنے پر مسکوویا کے امراء میں شامل کرلیے گئے ۔ بہت سے تاتاری اب بھی کازان کے گردو نواح میں آباد ہیں ۔

ان فتوحات کے بعد روسیوں اور ایشیائی تاتاریوں کا سالہا سال کا اختلاف اور جنگ و جدال ختم ہوا اور امن پھیلا ۔ مگر کریمیا کے تاتاری مزید دوسو سال تک مسکوویا کے لیے دردِ سر بنے رہے ۔ البتّہ زار کے زیرِ نگیں مشرقی علاقے میں امن ہوگیا ۔ علاوہ بریں وسیع اور زرخیز خطّوں سمیت دریائے والگا کا تمام رقبہ پہلی مرتبہ روسی نو آباد کاروں کے لیے کھُل گیا ۔ آئوان نے بڑی دانشمندی سے ان آباد کاروں کی ہر ممکن امداد اور حوصلہ افزائی کی اور بہت جلد وہاں سے روز افزوں مقدار میں غلّہ ، مویشی اور مچھلی روس میں پہنچنے لگی ۔ آئوان مغرب میں ۹۹
بھی تاتاریوں سے کہیں زیادہ طاقت ور دشمنوں کے ساتھ سخت لڑائیوں میں مصروف رہا ۔

نوودگراڈ اور بحیرۂ بالٹک کے راستے مغربی یورپ کے ساتھ روس کی جتنی تجارت تھی ''لیوونیا طبقے'' کے جرمنوں نے بالکل بند کردی ۔ مغربی یورپ کی اقوام کی ترقی کو تاتاری اقتدار کی آفت پیش نہ آئی تھی ۔ آئوان پہلا روسی تھا ۔ جس نے اندازہ لگایا

کہ روس کو ان سے صرف سامان ہی خریدنا نہیں بلکہ بہت کچھ سیکھنا بھی ہے۔
اس بناء پر اس نے ماسکو میں غیر ملکیوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ مثلاً
جب ایک انگریزی جہاز بحیرۂ ابیض کے راستے شمالی روس پہنچا تو وہ بے حد خوش
ہوا اور انگلستان کے ساتھ مسکوویا کے تجارتی تعلقات بڑھانے کے لیے آرکینجل
کی بندرگاہ بنائی۔ اس کے باوجود راستوں کی دشوار گزاری نے تجارت محدود
رکھی۔ روس کی بیرونی تجارت کا آسان راستہ بالٹک ہی سے تھا اس لیے مجبوراً
آئوان نے لیوونیا کے جرمنوں سے ساحل بالٹک لینے کے لیے ان پر چڑھائی کردی۔

آئوان کے فوجی سپہ سالاروں نے جرمنوں کو فوراً شکست دے کر علاقۂ بالٹک
یہ ٭ با۔ مگر عین اس وقت سویڈن اور لتھونیا آئوان پر حملہ آور ہو کر ان کے
سویڈن کو درحقیقت اپنی غرض تھی۔ وہ ساحلِ بالٹک پر روس کو
پ ہمسایہ نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ادھر لتھونیا اور مسکوویا میں پرانی عداوتیں تھیں
جن کا حساب چکانا تھا۔ لتھونیا اب تک کیف، والہینیا، سفید روس، اور قدیم روسی
علاقے پر قبضہ جمائے ہوئے تھا جو اس نے باتو کی یورش کے بعد جبراً لے لیے تھے۔
ماسکو کے عظیم ڈیوک کبھی ان علاقوں کی ملکیت کا دعویٰ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے
اس لیے روس اور لتھونیا میں ہمیشہ عناد رہا۔

اوّل اوّل تو آئوان کی افواج ان دونوں نئے حریفوں کے مقابلے میں زبردست
ثابت ہوئیں۔ انھوں نے بڑے ہنر اور سلیقے سے اہلِ سویڈن کو پچھاڑا اور لتھونیوں
۱۰۰ کو پے در پے فاش ہزیمتیں دیں۔ مگر بیتاب ہو کر لتھونیا نے پولینڈ کے ساتھ
اتحاد کا رشتہ جوڑا اور باہم مل کر یوستانی لتھونی حکومت بنائی۔ اب آئوان
کو چار متحد ریاستوں یعنی سویڈن، لتھونیا، پولینڈ اور باقی ماندہ "جرمن نظام"
سے نبرد آزما ہونا پڑا اور وہ مات کھا گیا۔

"پوستانی لتھونی"، حکومت کے نئے قابل بادشاہ نے روسیوں کو پے در پے زبردست شکستیں دیں۔ بیس سال تک یہ لڑائیاں چلتی رہیں جن سے مسکوویا تھک کر چور ہوگیا۔ آخر آئوان اپنی بے بسی کا اندازہ لگا کر ایک ناخوشگوار صلح پر رضامند ہوگیا۔

مگر آئوان کا ساحلِ بالٹک تک پہنچنے اور روس کے "مسروقہ" علاقے واپس لینے کا واضح نظریہ اس کے جانشین عمل میں لائے۔ مسلسل جنگوں اور بھاری قربانیوں کے بعد مستقبل کے زاروں نے وہ مقصد حاصل کر لیا جس میں آئوان ناکام رہا تھا۔ ۱۶۶۷ء میں زار الیکسیس نے کیف کو جو روس کا بنیادی شہر تھا واپس لے لیا۔ آئندہ سالوں میں مختلف موقعوں پر دوسرے روسی علاقے بھی دوبارہ فتح کر لیے۔ پھر اٹھارہویں صدی کے آغاز میں پیٹر اعظم نے ساحل بالٹک فتح کرکے اس پر سینٹ پیٹرز برگ کا شہر آباد کیا۔ یہ سب کچھ ثابت کرتا ہے کہ "وحشتناک" زار کی مدبرانہ پیش بینی کتنی زبردست تھی۔

آئوان کے عہد میں روس کی آبادی میں "کاسکوں" کا نیا گروہ نمودار ہوا۔ اگرچہ کاسک روسی نسل سے ہیں مگر یہ لفظ تاتاری ہے جس کے معنی ہیں "سرحدی لوگ" حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے روسی معاشرے میں وہ کردار ادا کیا جو امریکہ کے سرحدی باشندوں نے پچھلی صدی کے تیسرے عشرے میں "ٹینے سی" کینٹکی اور شمال مغربی علاقے میں کیا تھا۔

کاسک نہایت دلیر مہم جو تھے۔ ان میں کچھ زندگی کی مصائب سے تنگ آئے ہوئے اور کچھ قانون کی گرفت سے بھاگے ہوئے لوگ تھے جو مسکوویا کی مشرقی، جنوب مشرقی اور جنوب مغربی حدود پار کرکے روس اور دیگر اقوام کے مابین واقع جنگلی میدان میں چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی آبادیاں قائم کیں اور علاقائی

نسبت سے یورال ، ڈان ، کیوبن اور نیپر کاسک کہلائے ۔ اس طرح مسکوویا اپنی حدود کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں سے گھِر گیا ۔ یہ درحقیقت جمہوریتیں تھیں کیونکہ زار حکومت کا قانون ان کاسکوں پر نافذ نہ تھا کاسکوں کے یہ علاقائی گروہ اپنی منتخب مجلس اور سردار کے زیر فرمان تھے ۔ تمام کاسک مساوی درجہ رکھتے تھے ۔ ان آبادیوں میں زندگی آزاد ، خود سر لیکن خوش رنگ تھی۔ ان کی گزران جنگ اور مالِ غنیمت پر تھی ۔ ”ڈان کاسک“ شمالی قفقاز کے باشندوں پر متواتر حملہ آور ہوتے اور وہ ان پر جوابی حملے کرتے ۔ ”نیپر کاسک“ کریمیا کے تاتاریوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے اور لتھونیا اور پولینڈ کے علاقوں کو تاراج کرتے رہتے ۔

آئوان اور کئی دوسرے زار کاسکوں کے ساتھ مُدارات کرتے رہے کیونکہ یہ آزاد اور بے قابو لوگ ”جنگلی میدان“ میں روس کے بنیاد کار تھے اور جب کبھی مسکوویا ”پولستانی لتھونی“ حکومت کے ساتھ نبرد آزماء ہوا یہ ہمیشہ اس کے غیر رسمی حلیف بنے رہے ۔

آئوان کی حکومت کے آخری سالوں میں کاسکوں کا وجود مسکوویا کے لیے غیر معمولی افادیت اور تقویت کا باعث ہوا ۔ ایک تاتاری سردار کُچم نامی نے کوہستان یورال کے مشرق میں دریائے اِرتش کے کنارے ایک ریاست کی بناء ڈالی اور یہاں سے اس نے والگا کے ساحل پر واقع روسی نوآبادیوں پر یورشیں شروع کیں ۔ یُورالی کاسکوں کا زعیم یرمک نامی کُچم کے مقابلے میں صف آرا ہوا ۔ اس کے پاس صرف آٹھ سو چالیس سوار تھے مگر تاتاریوں پر اس نے ایسے جوش اور ہنرمندی سے شب خون مارے کہ وہ اچانک حملوں کی تاب نہ لاکر اپنی ریاست چھوڑنے پر مجبور ہوئے ۔ یرمک نے اپنی کامیابی کی اطلاع زار کو

دی۔ آئوان خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ اس نے یرمک کو بیش قیمت تحائف اور طاقتور امدادی فوجی دستے بھیجے۔ اس طرح فتح سائبیریا کا آغاز ہوا کیونکہ اہل مسکودیا کوہستان یورال کے پورے مشرقی وسیع علاقے کو " ریاستِ کچم " کے نام سے پکارنے لگے۔

اٹھارہویں صدی میں جب سلطنتِ روس تمام اطراف میں پھیلی اور بالخصوص
۱۰۲ بحیرۂ اسود تک پہنچ گئی۔ تو کاسکوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اس میں ضم کردی گئیں مگر ضم ہونے کے بعد بھی انھوں نے اپنی مقامی حکومتیں قائم رکھیں اور آج بھی سوویٹ فوج میں تیز طرّار، بے خوف جانباز اور معرکہ آرا کاسکوں کے علیحدہ دستے ہیں۔

آئوان کا دوسرا بیٹا شفیق مزاج مگر بزدل اور نااہل زار فیوڈار ۱۵۹۸ء میں بے اولاد مرگیا۔ "وحشت ناک" زار کا آخری بیٹا ڈمٹری نو سال کی عمر میں ایک حادثے کی نذر ہوگیا اور اس طرح مسکودیا کے عظیم ڈیوک اور زاروں کی نسل ختم ہوگئی۔

اب آئوان کے منظور نظر معاونین میں سے ایک شخص بورس گاڈوناف تخت پر قابض ہوا وہ بڑا طاقتور فہیم، دقیقہ رس اور ملک کا بہی خواہ تھا۔ مگر خواہ مخواہ اہل مسکودیا اسے ناپسند کرتے تھے اور انہیں یقین تھا (گو بلا وجہ) کہ وہ حادثہ جس نے ہونے والے زار ڈمٹری کی جان لے لی۔ اسی شخص کی سازش سے ہوا۔ اسی اثناء میں پولینڈ سے ایک شخص نے ڈمٹری ہونے کا دعویٰ کیا اس کا بیان تھا کہ وہ معجزانہ طور پر بورس کے مقرر کردہ قاتلوں کے پھندے سے بچ نکلا تھا اور کوئی اور لڑکا اس کی جگہ مار کر دفن کر دیا گیا تھا۔ پولستانیوں کی تائید سے وہ ایک چھوٹی سی فوج بھرتی کرکے اپنے اجداد کا تخت حاصل کرنے

کے لیے ماسکو سے جنگ لڑنے آن پہنچا۔ عین اسی وقت زار بورس مرگیا۔ روسیوں کے دلوں میں "وہشت ناک" آئوان اور اس کے بیٹے کے سائے تک کے لیے ایسا احترام اور رعب و داب تھا کہ انھوں نے بورس گاڈوناف کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بڑے جوش و خروش سے اسی مدّعی ڈِمِٹری کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔

مگر جلد ہی اس اقدام سے انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ ثابت ہوا کہ زار ڈِمِٹری محض فریبی تھا اور مزید برآں ذلیل بھی اس کا برتاؤ بُرا تھا اور وہ کلیسا کا قطعاً احترام نہ کرتا تھا۔ اس نے ایک پولستانی عورت سے شادی کی اور پولستانیوں کو اجازت دے دی کہ وہ ماسکو میں آقا بنے پھریں۔ اس پر اہلِ مسکوویا نے برا فروختہ ہوکر اس کا خاتمہ کر دیا۔

پورے دو سال تک انتہائی بدامنی اور انتشار کا دَور دورہ رہا۔ تخت و تاج کے متعدد چھوٹے چھوٹے دعوے دار نمودار ہوئے اور خوں ریز خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ کاسکوں نے جھوٹ موٹ کا ایک اور ڈِمِٹری کھڑا کرکے الجھنوں میں اضافہ کر دیا۔ کاسکوں اور دوسرے گروہوں نے شہروں اور صوبوں کو خوب لوٹا۔ پھر قحط نے تباہی مچائی۔ ان حالات سے استفادہ کرتے ہوئے پولستانیوں نے ماسکو پر قبضہ کرکے اپنے بادشاہ کے بیٹے شہزادہ ولاڈی سلاف کو روسی تخت پر بٹھا دیا۔

پولینڈ کی یہ مداخلت انتشار اور ہنگاموں سے تھکے ہارے روسیوں کی عقل ٹھکانے لگانے میں معاون ہوئی۔ والگا کے کنارے "نزہنی نووگراڈ" سے (جو اب گورکی کہلاتا ہے) دو محبِّ وطن آدمیوں یعنی شہزادہ "پوزہارسکی" اور دوسرا ایک عام شہری مینن نے اس بدنظمی کو ختم کرنے کے لیے عوامی فوج کی بھرتی شروع کر دی۔ کلیسا ان کا زبردست پشت و پناہ بنا۔ دوسرے شہروں سے بڑی

افراط سے روپیہ ملا اور جوق در جوق رضا کار امڈ آئے۔ بہت جلد شہزادہ پوزہارسکی جو ایک قابل سپہ سالار تھا ان افواج کا سربراہ بنا دیا گیا۔ کئی ایک سخت معرکوں کے بعد پولستانیوں کو ہزیمت ہوئی اور وہ روس بدر کیے گئے۔ ان کی حفاظتی فوج نے جو ماسکو کے اندر رہ گئی تھی طویل محاصرے کے نتیجے میں ہتھیار ڈال دیے۔

امن وامان قائم ہونے پر پوزہارسکی، مَنِین اور ان کے وفادار معاون شہزادہ تروبت سکوئی نے "وحشت ناک" آئوان کے نمونے کی نمائندہ مجلس کا اجلاس طلب کیا۔ تمام طبقوں اور علاقوں کے مندوب اس میں شریک تھے۔ اس اجلاس کا مقصد زار کا انتخاب تھا۔ روس میں اس وقت بھی ریورک خاندان کے بہت سے شہزادے موجود تھے اور ان میں سے کوئی ایک تخت کا قدرتی امیدوار سمجھا جا سکتا تھا۔ مگر یہ بھی کھٹکا تھا کہ بالفرض کسی شہزادہ "شوئیسکی" یا "بیلسکی" کے منتخب ہو جانے پر ریورک کے دوسرے لاتعداد اخلاف حسد سے مغلوب ہو کر اپنے اپنے مددگار دستے لیے میدان میں آ کودیں تو نئی خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

اس بناء پر "مجلس" نے خاندانِ ریورک کے شہزادوں کا خیال ترک کر دیا اور اس کی جگہ نوجوان مائیکل رومناف کو تاج پیش کیا۔ اِس انتخاب کی بڑی اہم وجوہ تھیں۔ رومناف روس کا ایک قدیم رئیس خاندان تھا جس کا کردار اعلیٰ روایات کا امین تھا۔ مائیکل کی پھوپھیا دادی اناستاشیا "وحشت ناک" آئوان کی پہلی اور بڑی چہیتی بیوی تھی اور روسی ابھی تک اس کی نیکیوں کو یاد کرتے تھے۔ انھیں اس کا بڑا احترام تھا۔ پھر اس نوجوان کا باپ عظیم بشپ فلاریٹ بھی معزز ترین روسی پادری تھا جس نے حب وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر بڑی بہادری سے پولستانیوں کی مدافعت کی تھی اور ابھی تک ان کی قید میں تھا۔ اپنے انتخاب کے وقت مائیکل رومناف

ماسکو سے بہت دور اپاتیف کے راہب خانے میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ ایک شرمیلا، پاک باطن اور جذبۂ اقتدار سے بے نیاز نوجوان تھا۔ ایک عرصے تک وہ اس کچل ڈالنے والی ذمہ داری اور اعزاز کا بوجھ جو اس پر جبراً ڈالا گیا تھا اٹھانے سے انکار کرتا رہا اور صرف اس وقت ماسکو آیا جب اسے وثوق کے ساتھ یقین ہو گیا کہ روس اسے زار آئوان کا تاج پہنانے کا فی الواقع آرزو مند ہے۔ جب وہ گھوڑے پر سوار وارد شہر ہوا تو ماسکو کے ایک ہزار چھ سو کلیساؤں کے گھنٹے بجے اور مسرور ہجوم نے خوشی کے نعرے لگائے۔

اس طرح سعادت سمجھیے یا نکبت بہر حال ۱۶۱۳ء میں روس نے اپنی قسمت کی باگ ڈور رومناف خاندان کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس خاندان کے زاروں نے تین سو سال تک روس پر حکمرانی کی تا آنکہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب نے اسے ختم کر دیا۔

باب ۰ ۶

شہنشاہ

روس کی قومی زندگی جس زبردست بدنصیبی کا شکار رہی تھی سترھویں صدی میں وہ مزید شدّ و مد سے اثر انداز ہونے لگی وہ اس طرح کہ مغربی یورپی ممالک کے مقابلے میں مسکو دیا نہایت پسماندہ ملک تھا۔ مغرب میں علوم، فنون لطیفہ اور سائنس کو مدّتوں پہلے سے مذہب سے جدا کرکے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی دی جارہی تھی چنانچہ سولھویں اور سترہویں صدیاں ان کے ارتقاء اور پھولنے پھلنے کا سنہری زمانہ ثابت ہوئیں لیکن مسکودیا کا نقشہ کچھ اور تھا۔ تہذیب و ثقافت کے تھوڑے بہت جس سرمائے پر اسے کچھ ناز ہوسکتا تھا۔ وہ دسویں اور تیرہویں صدی کے درمیانی عرصہ میں بزنطینہ (مشرقی سلطنت روما) سے ملا تھا۔ اس دَور کے لیے اتنی ہی تہذیب کافی تھی۔ چنانچہ عظیم ڈیوک یارو سلاف کے عہد کا گیارھویں صدی کا کیفی روس اس زمانے کے معیار پر پورا اترتا تھا۔ مگر اس کے بعد سے مسکودیا نے شاذ ہی کچھ ترقی کی اور سترہویں صدی میں تو یہ کیفیت ہوئی کہ اِس ضمن میں اقوامِ مغرب سے تین یا چار صدیاں پیچھے رہ گیا۔

ادھر انگلستان اور فرانس نے شیکسپیئر، مولیر، رانسارڈ اور دوسرے عظیم مصنّف پیدا کیے اور تھیٹر کو اتنا عروج دیا کہ زمانہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکا۔ دوسری طرف روس کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں کوئی لفظ "ادب" سے

آشنا تک نہ تھا۔ یہاں ابھی ابتدائی قسم کے قصے کہانیاں ہی چل رہے تھے اور دانایانِ مسکوویا کے پاس پرانی مذہبی کتابوں کے سوا کچھ پڑھنے کو نہ تھا۔ مغربی یورپ تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہاں انگلستان میں نیوٹن، جرمنی میں لبنز وغیرہ عظیم ماہر ریاضیات کو جدید شکل دے بھی چکے تھے۔ مگر روسی ابتدائی حساب سے آگے نہ بڑھے تھے۔ اور سائنس کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ روسی عمائد اور امراء ابھی تک پرانی بزنطینی وضع کی داڑھیاں رکھتے اور لمبے لمبے لبادے پہنتے تھے۔ سروں پر اونچی اونچی تکلیف دہ ٹوپیاں ہوتیں اور شانِ امارت دکھانے کو ملازمین کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر خراماں خراماں چلتے تھے۔ ۱۰۶

مغرب کی تابناک سماجی زندگی کے برعکس مسکوویا کی اجتماعی زندگی بہت پست تھی۔ عورتوں کا اس میں کوئی مقام نہ تھا۔ وہ تو تاتاری غلبے کے وقت سے ہی حرم میں نیم مستور رہتی تھیں۔

روس کی ثقافتی پسماندگی کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ تاتاریوں کے دوسو سالہ تسلّط کے دوران میں اس کی ترقی رُکی رہی اور یہ یورپ کی عام ثقافتی زندگی کے اثر سے الگ تھلگ رہا۔ جب اس غلبے کا جوا اتار پھینکا گیا تو مشرقی رومی سلطنت پر جو روسی تمدّن کا سرچشمہ تھی ترکوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور روسی اب اس سے کوئی استفادہ نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں ثقافتی ترقی کے لیے کسی قدر دولت و ثروت کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے جو ناپید تھی۔ اس اثناء میں مسکوویا کو اپنی بقاء اور کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیافت کے لیے جنگیں بھی لڑنی پڑیں یہ دشواری کسی اور مغربی قوم کو اس حد تک پیش نہیں آئی۔ مثلاً ۱۵۰۰ تا ۱۶۰۰ء کے سو سال میں سے پچاس تو لتھونیا، پولینڈ اور سویڈن ہی سے نبرد آزمائی میں ضائع ہو گئے۔ پھر کریمیا کے تاتاریوں کے مسلسل حملے روکنے اور مشرق میں

دیگر تاتاری قبیلوں سے لڑائی بھڑائی کرنے میں بھی وقت صرف ہوا۔

ان لڑائیوں نے مسکوویا کے مادّی وسائل کے سرچشموں کو سراسر سُکھا دیا۔ پھر لتھونیا، پولینڈ اور سویڈن سے لڑائیوں کی بدولت ایسی دیواریں حائل ہوگئیں کہ مسکوویا مغربی یورپ سے خود بخود کٹ گیا۔

روسیوں کے لیے ملک کا یہ جمود روز بروز زیادہ خطرناک بنتا جارہا تھا۔ اقوام مغرب نے عظیم مفکّر ہی پیدا نہ کیے بلکہ ایسی صنعتی تکنیک بھی ایجاد کیں جس سے ماسکو والے قطعاً نابلد تھے۔ جرمنوں یا ولندیزوں نے دھاتیں پگھلائیں آتشیں اسلحہ بنایا اور روسیوں سے بڑھ چڑھ کر کئی قسم کے عمدہ اوزار تیار کیے۔ ان کے حربی طریقے اور سامان مدّتوں پہلے روسی طریقوں اور سامان پر فوقیت حاصل کرچکا تھا۔ اسی لیے سویڈن جیسی مغربی طاقت سے جنگ آزمائی روس کے لیے روز بروز دشوار تر ہوتی جارہی تھی۔

"وحشت ناک" آئوان تو روس کی اس پسماندگی سے باخبر ہی تھا اس کے دو پیشرو رومن نژاد روسی شہنشاہ مائیکل اور اس کے بیٹے الیکسیس نے بھی یہ صورتِ حال بھانپ لی تھی اس لیے وہ بیرونی ماہروں کو بیش بہا تنخواہیں دے کر بڑی تعداد میں بلاتے رہے۔ ان زاروں کے عہد میں انگریز اور جرمن اطباءُ درباری معالج مقرر کیے گئے۔ ماسکو میں اوّلیں دواخانہ غیرملکیوں نے کھولا اور تولا کے مقام پر فولاد کی جدید قسم کی پہلی بھٹی اور بندوقیں ڈھالنے کا کارخانہ انھی نے قائم کیا۔ روسی مسلح فوج کی تربیت کے لیے بھی غیرملکی ماہرینِ حرب ملازم رکھے گئے۔ ماسکو کے قریب تقریباً ایک ہزار جرمنوں کی مکمل نواحی بستی بس گئی (ماسکو کے لوگ پراٹسٹنٹ عقیدے کے تمام غیرملکیوں کو جرمن ہی کہتے تھے) مگر ان چند تدبیروں سے کیا بنتا تھا۔ روس کو مغربی تہذیب کے معیار پر لانے کے لیے کہیں زیادہ محنت درکار تھی اور اصلاحات کے نفاذ میں بہت سے موانع حائل تھے۔

حسنِ اتفاق سے اس وقت زار ترقی پسند تھے اور ان کے بعض امراء بھی روشن خیال اور مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ مگر عوام تو ایک طرف رہے امراء کی بھاری اکثریت اور راہب غیر ملکی طور طریقوں کے سخت مخالف تھے۔ انھیں اس میں غیر مسیحی رجحان بلکہ الحاد نظر آتا تھا۔ بالخصوص جب یہ اجنبی طور طریقے ان رومن کیتھولک ملکوں کے تھے جن سے مشرقی کلیسا اور رومی کلیسا کی قدیم عداوت کے باعث اختلاف عقائد تھا۔ اس لیے وہ ان کے اور بھی دشمن بن گئے۔ البتہ جرمنی، ہالینڈ، انگلستان جیسے پراٹسٹنٹ ملکوں کے طریقوں سے کم تعرّض کیا گیا۔ چنانچہ وہیں کے باشندوں کو مسکوویا بلایا گیا۔ لیکن ان پر بھی اعتراض کیا جاتا رہا مثلاً جب ایک مغرب زدہ زعیم ماتویف نے اپنے محلّ میں تھیٹر کا اہتمام کیا اور زار الیکسیس اس میں تماشا دیکھ کر محظوظ ہوا تو ماسکو کے لوگوں نے خاصی خفگی ظاہر کی کیونکہ بہتوں کے نزدیک ایسے مناظر دیکھنا گناہ تھا۔ طویل جمود کی وجہ سے بہت سے روسی رجعتی اور متعصب بن گئے تھے۔

غرض کسی گہری تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا یہی لیل و نہار تھے ۱۶۸۹ء ۱۰۸
میں پیٹر اعظم روس کے تخت پر بیٹھا جس کی شخصیت اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ بلند تھی۔

یہ قوی ہیکل شخص جس کے گول مثالی روسی چہرے پر اعصابی تناؤ سے شکنیں پڑی تھیں۔ فولادی قوت اور ایک پورے فوجی دستے کی جسمانی اور ذہنی توانائی کا مالک تھا۔ اس نے ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں وہ کچھ کر دکھایا جو بہ ظاہر ناممکن تھا۔ اس کی حکومت روس پر ایک بگولے کی طرح چھا گئی۔ اس نے مافوق الفطرت جدوجہد اور اہم انقلابی اصلاحات سے مسکوویا کو مہذب یورپ کے راستے پر لا ڈالا۔ شدید محنت اور ان تھک کام کی بدولت جس نے رات کو پانچ گھنٹے سے زیادہ اسے سونے نہ دیا اور بسا اوقات نیند سے بالکل محروم رکھا، اس نے ایک لرزہ خیز ریلا دیا اور شدید جھٹکے

سے اس وسیع سرزمین کو صدیوں کی خوابِ غفلت سے جگا کر یکدم اٹھا بٹھایا ۔ المختصر جب
۱۷۲۵ء میں ترپن سال کی عمر پا کر وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا
اس کے آباو اجداد زاروں کے فرسودہ نظامِ حکومت سے مسکوویا کی گلو خلاصی ہو گئی تھی اور
پیٹرز برگ کی نئی سلطنت نے جو مغربی یورپی حکومتوں کا نمونہ تھی اس کی جگہ لے لی تھی
اور قائم ہوتے ہی سیاسیاتِ یورپ میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

پیٹر کی ابتدائی زندگی غیر معمولی تھی ۔ وہ دوسری بیوی سے زار الیکسیس
کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جس کی عمر بڑے بھائی کی وفات کے وقت دس سال تھی۔
چونکہ کوئی اور جانشین نہ تھا اسے زار بنا دیا گیا اور اس کی سوتیلی بہن سوفیہ نگراں
مقرر ہوئی ۔ مگر سوفیہ نے اس پر اکتفا نہ کی اور امنگوں کے جوش میں حکومت غصب
کرنے کی ٹھانی ۔ اس کے مددگار زبردستی کریملن میں جا گھسے اور پیٹر کی آنکھوں
کے سامنے اس کے ننھیالی عزیزوں اور معاونوں کو تہِ تیغ کیا ۔ پھر یہ کمسن زار
اپنی ماں کے ساتھ ماسکو شہر سے دُور پروبرازنکوئی گاؤں کے محل میں جلاوطن کر دیا
گیا ۔ وہاں وہ ایک عام رئیس زادے کی طرح کھیتوں میں پھرنے اور کھیلنے کے لیے
چھوڑ دیا گیا اور سوفیہ حکمراں رہی ۔

جلاوطنی کے دوران میں پیٹر کو قرونِ وسطیٰ کے پرانے طرز کی وہی مذہبی
تعلیم ملی جو عام طور پر زاروں کو دی جاتی تھی ۔ اِسی وجہ سے وہ ہمیشہ اِملا میں
کمزور رہا ۔ مگر فطری جذبے سے اس نے ذوق کے مطابق اپنے لیے تعلیم کا خود ١٠٩
سامان کیا ۔ موضع پروبرازنکوئی ماسکو کی جرمن نوآبادی کے قریب تھا ۔ کم سن پیٹر
نے چند غیر ملکیوں سے جو وہاں آباد تھے دوستی گانٹھی اور ان کے گھروں میں بے
تکلف آنے جانے لگا ۔ اس کے ذہن میں حیرت انگیز تیزی اور تجسس تھا ۔ وہ ہر نیا
اوزار دیکھ کر شوق کے مارے کپکپا جاتا ۔ ان غیر ملکی دوستوں سے اس نے ریاضی

اور دوسرے مضامین کے سبق لیے۔ اِسکاٹ لینڈ کے باشندے جنرل گارڈن نے جو روسی فوج میں تھا اسے قلعہ بندی اور توپخانے کا استعمال سکھایا۔ علم کے ان اجزائے پریشان نے جنھیں وہ دماغ میں والہانہ جذب کر لیتا اس غیر معمولی فہم کے بچّے پر واضح کر دیا کہ مسکوویا کا نظام فرسودہ ہو چکا ہے اور مغربی فکر و فراست بہت سودمند ہے۔

پھر ان سینکڑوں دہقان اور امراء لڑکوں میں سے جو کھیتوں اور میدانوں میں اس کے ہم جولی تھے اس نے دو فوجی دستے منظم کیے اور گاؤں کے ناموں کی نسبت سے انھیں "پریو براژنسکی" اور "سیمیونا وِسکی" نام دیا۔ زارینہ سوفیہ کو ان "کھیلوں" میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ اس نے نخوت کے ساتھ اسے پریوبراژنسکی اصطبل کے لڑکوں کا کھیل کہہ کر نظر انداز کر دیا اور ماسکو کے اسلحہ خانے سے کچھ ہتھیار اور بارود لینے کی بھی اجازت دے دی۔ مگر چودہ سالہ پیٹر نے بچوں کے اس کھیل کو ایک نہایت سنجیدہ نظام بنا دیا۔ گارڈن کی مدد سے اس نے ان دستوں کو یورپی طرز کی اعلیٰ فوجی تربیت دی۔ وہ مصنوعی شہر بناتے اور دھاوا بول کر انھیں سر کر لیتے وہ احکام جاری کرتا جن پر مکمل عمل درآمد ہوتا تھا۔ اس طرح بلا مقصد اپنے تصوّر کی چھوٹی سی دنیا میں کھیلتے کھیلتے پیٹر اس کارِ عظیم کے لیے تیار ہو رہا تھا جو مستقبل میں اس کا منتظر تھا۔

پھر ۱۶۸۹ء کی ایک رات کو معلوم ہوا کہ سوفیہ اپنے سوتیلے بھائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے فوجیں جمع کر رہی ہے۔ پیٹر کو جگایا گیا۔ اسے جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ اسی رات کے اس واقعے نے اس کے چہرے پر اعصابی شکن پیدا کر دی تھی۔ مگر زارینہ کا منصوبہ ناکام رہا کیونکہ مسکوویا کی فوجی اکثریت نے قانوناً حقدار زار پیٹر کے ساتھ وفاداری کا دم بھرا اور سوفیہ کے مددگاروں نے مقابلتاً بڑی تعداد کے سامنے بغیر کسی چپقلش کے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں یہ سترہ سالہ زار مسکوویا کا مکمل حکمراں

بن گیا۔ اس کی سوتیلی بہن کسی خانقاہ میں چلی گئی اور ناکام بغاوت کے سرغنے قتل کر دیے گئے۔

اسی گھڑی سے پیٹر کے تصوّر کی "پریو براژنکوئی" والی تجاویز نے خود بخود روس کی حکومت کا روپ دھار لیا۔ اس کے بچپن کے دوست، اس کا اتالیق شہزادہ گولٹسن اور تیز طرّار، مدمّغ دہقان زادے مینشیکاف سے لے کر جنرل گارڈن تک اس کے اعلیٰ مدبّر اور فوجی کمانڈر بنے۔ دونو فوجی دستے شاہی باڈی گارڈ کی زینت بنے اور اپنے عہد میں پیٹر نے جو لڑائیاں لڑیں ان میں وہ بے مثال دلیری اور ہنرمندی سے دادِ شجاعت دیتے رہے۔

زندگی بھر پیٹر کو اپنی ناکافی اور نامکمل تعلیم کا احساس رہا اور نئی معلومات کی پیاس غالب رہی۔ اس کی ایک نجی مہر پہ "میں پڑھ رہا ہوں اور پڑھانے والے ڈھونڈ رہا ہوں" کے الفاظ کندہ تھے۔ مزید برآں اس کی بچپن کی بذریعہ تجربہ سیکھنے کی عادت برقرار رہی۔ ایک وقت آیا کہ اسے روس کے لیے طاقتور جنگی بیڑے کی ضرورت کا سختی سے احساس ہوا۔ مگر روسی قطعاً جہاز سازی نہ جانتے تھے۔ اس لیے ۱۶۹۷ء میں حکومت کے اشد لازمی امور کو چھوڑ کر وہ پیٹر منیلاف کے بھیس میں ہالینڈ گیا اور کئی ماہ تک ایمسٹرڈیم کی جہاز گاہ پر ایک کاریگر کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ وہ انگلستان بھی گیا جہاں اس نے جہاز سازی کے اصولوں کا مطالعہ کیا اور ماہرِ فن بن کر ماسکو واپس آیا۔ بعد ازاں پیٹر نے دانتوں کا علاج بھی سیکھا۔ مگر یہ علم اس کے احباب کے لیے مصیبت بن گیا۔ کیونکہ نئے ہنر کی نمود و نمائش کے لیے وہ دوستوں کو زبردستی کرسیوں میں دھکیل دیتا اور نہ صرف بیمار دانتوں کو نکالتا بلکہ اچھے بھلے بھی اکھاڑ پھینکتا۔ پھر قہقہے لگا کر وہ ان کے سوجے ہوئے مسوڑھوں پر دوا لگاتا اور شراب کے پیالوں سے ان کی تسکین کرتا۔

پیٹر کی اصلاحات نے روسی زندگی کے ہر پہلو اثر ڈالا۔ ۱۶۹۸ء میں اس نے امراء
اور شہریوں کو حکم دیا کہ وہ داڑھیاں منڈوائیں۔ بزنطینی لباس ترک کر کے ریشمی جرابیں 111
چست مغربی جیکٹیں اور کلاہ استعمال کریں۔ امراء کی خواتین کو بھی حکم ملا کہ وہ یورپی لمبے گاؤن اور چوڑے حاشیے والی کلغی دار ٹوپیاں پہنیں۔ صرف پادریوں اور دہقانوں کو سابقہ لباس اور داڑھیوں کی اجازت رہی۔ یقیناً یہ اقدام ایک سطحی تبدیلی کا حامل تھا مگر پیٹر نے خوب جان لیا تھا کہ جب روسی نئے لباس کے عادی ہوں گے تو وہ یورپی فیشن بھی اپنائیں گے اور رفتہ رفتہ طریق زندگی اور یورپ کی عام چیزوں سے بھی انہیں دلچسپی ہو جائے گی۔

رفتہ رفتہ پیٹر نے ایک اور حکم دیا کہ ممتاز خاندان سوشل تقریبوں کا اہتمام کریں جن میں امراء اور اعلیٰ شہری مع خواتین کے مدعو ہوں۔ ان اجتماعوں میں شمولیت لازمی تھی۔ ان میں مہمان باتیں کرتے رہتے اور نوجوان جوڑے یورپی رقص سے محظوظ ہوتے۔ واضح ہو کہ اس وقت تک مسکودیا میں دہقانوں کو چھوڑ کر برسرِ عام رقص کا وجود نہ تھا۔ اس طرح خواتین محلوں کی بندشوں سے پہلی بار با جبر نکالی گئیں اور زار کے حکم سے یورپ کی زندگی نے روس میں جنم لیا۔

پیٹر روسیوں کو یورپی تعلیم سے بہرہ ور دیکھنے کا بے حد شائق تھا۔ بڑے شہروں میں اس نے بہت سے گرامر، ریاضی، انجینئرنگ اور غیر ملکی زبانوں کے سکول کھولے اور ان درس گاہوں کے دروازے ہر طبقے کے آزاد افراد کے لیے کھلے رکھے۔ بعد ازاں اس نے طبعیاتی علوم کی اکاڈمی قائم کی اور روسی سائنس دان تیار کرنے کے لیے جرمن پروفیسر بلائے۔ اس وقت تک عوام کا تو کیا ذکر امرائے مسکودیا کی بڑی اکثریت بھی ان پڑھ تھی۔ ناخواندگی کے خلاف مہم جلد از جلد بار آور بنانے کیلئے زار نے قانون جاری کیا کہ کوئی امیر جب تک وہ خواندگی اور بعض دوسرے مضامین

سے واقفیت کا امتحان پاس نہ کرے شادی نہ کر سکے گا اور نہ ہی افسر کا رتبہ پا سکے گا۔ علاوہ ازیں زار نے بیسیوں نوجوان غیر ممالک میں سائنس، فنِ تعمیر اور انجینیرنگ سیکھنے کے لیے بھیجے۔

پیٹر کے عہد سے پہلے صرف شہزادے، امراء اور دوسرے اعلیٰ خاندانوں کے ارکان ہی فوجی کمانڈر، سفیر، صوبوں کے گورنر اور دوسرے اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے۔ پیٹر نے عالی خاندانی کے اس طلسم کو توڑا اور سرکاری ملازمت کے پورے نظام کو محنت اور قابلیت کی بنیادوں پر استوار کیا۔ ہر روسی نوجوان خواہ شہزادہ ہو یا قلاش عامی سب فوج میں سپاہی اور سول ملازمت میں معمولی کلرک کی حیثیت سے داخل ہونے لگے۔ افسر کا مرتبہ وہ تعلیمی امتحان پاس کرنے پر ہی حاصل کر سکتا تھا اور اعلیٰ خدمات ہی مزید ترقیوں کی اہلیت کا واحد ذریعہ تھیں۔ اس طرح غیر معروف عوام جرنیل ہو سکتے تھے اور ہوئے بھی اور خواص عدم قابلیت کی بنا پر سپاہی رہ گئے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ عامی شخص فوجی یا سول ملازمت کا بلند رتبہ حاصل کرنے پر جدّی رئیس بن گیا۔ ان نئے اصولوں کے زیر اثر پیٹر نے امراء کی مشاورتی کونسل توڑ دی اور اس کی بجائے ملکی معاملات میں مشورہ لینے کے لیے وہ مختلف محکموں کے سرکردہ افسروں کے کابینے کا اجلاس طلب کر لیتا۔ امراء کا تو لفظ ہی متروک ہو گیا۔ البتہ شہزادے کا سابق روسی خطاب چلتا رہا۔ علاوہ بریں یورپ کی مثال پر کاربند ہوتے ہوئے پیٹر نے امتیازی خدمات بجا لانے والوں کو بیرن اور کاؤنٹ کے نئے القاب سے نوازا۔

پھر پیٹر نے ماسکو کے پورے فوجی نظام کی ازسرِ نو تنظیم کی۔ پہلے اس کی اکثریت قرونِ وسطیٰ کے گھڑ سوار دستوں پر مشتمل تھی جن کے سربراہ امراء ہوتے تھے۔ یہ

کوئی مستقل فوج نہ تھی اور صرف جنگ کے وقت بھرتی کی جاتی تھی ۔ باقاعدہ فوج کا جز وہی دستے تھے جو نچلے طبقے سے بھرتی کر کے غیر ملکی ماہرین کی تربیت میں دیے جاتے تھے ۔ مگر ان کی تعداد قلیل تھی اور جب تمام یورپ کے پاس مکمل تربیت یافتہ پیشہ ور افواج تھیں تو روس کو اس ضرورت کا احساس کیسے نہ ہوتا ۔ اس لیے پیٹر نے امراء کے ہنگامی حالات میں بھرتی کیے ہوئے دستے اور مسلح پیادہ فوج کو ختم کر دیا اور ان کی جگہ باقاعدہ دستوں کی جرّار فوج بنائی جس میں عوام اور خواص اکٹھے خدمات بجا لانے لگے ۔

یہی نہیں ، پیٹر نے "ماسکو نیوز" جاری کیا جو اوّلین روسی اخبار تھا اور اس کی اوّلین اشاعتیں خود نکالیں ۔ وہ چھاپنے اور کندہ کرنے کا کام بھی جانتا تھا ۔ اس کے حکم سے روس میں مختلف مضامین کی کتابیں غیر زبانوں سے ترجمہ ہو کر تیار ہونے لگیں ۔ صنعتی ترقی کو جو زار کا نصب العین تھی فروغ دینے کے لیے اس نے جدید کان کنی ، صفّار خانے ، پارچہ بافی اور دوسرے کارخانے سرکاری خرچ پر تیار کر کے امراء اور تاجروں کو بیچ دیے ۔ یہ بھی معلوم رہے کہ کوہستان یورال کے معدنی خزانوں سے استفادہ کرنے کی تجاویز اسی نے شروع کیں جو اوّل اوّل چھوٹے پیمانے پر تھیں ۔

ابتداء میں پیٹر کی اصلاحات نے سخت الجھنیں پیدا کیں ۔ بعض ایک مثلاً داڑھیاں منڈوانے اور یورپی لباس پہننے کے احکام نے غصے اور مخالفت کے طوفان برپا کر دیے ۔ پرانی طرز کے امراء اور زعماء نے غیر ملکی دہقانی لباس کو مذہب اور اپنے رتبے کی ناقابلِ برداشت توہین قرار دیا ۔ پیٹر نے بہت سے لوگوں کو داڑھیوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹا کہ وہ انہیں منڈوا دیں مگر مدافعت ہمیشہ اسی تماشے پر ختم نہ ہوئی بلکہ کبھی کبھی خطرناک صورت بھی اختیار کر گئی

فوجی تنظیم کے وقت بھی پیٹر کو مسلّح پیادہ دستوں کی وسیع بغاوت فرو کرنی پڑی ۱۱۳
تھی کیونکہ وہ لوگ پرانے طریق پر قائم رہنا چاہتے تھے ۔ دو ہزار کے قریب
تو قتل کیے گئے ۔ پھر قدیم اور جدید یعنی روسی اور یورپی امتزاج کا ماحصل وہ طبقہ بھی
تھا جس کے دل و دماغ میں اس بے ترتیب مرکّب نے خلجان پیدا کر رکھا تھا۔ اگرچہ
عالمِ شباب میں غیر مدبّرانہ تعجیل کے ساتھ اس نوعیت کا فوری انقلاب ٹھونسنے اور
بلا ضرورت اپنی کچھ رعایا کو ناراض کر کے اپنی الجھنوں میں پیٹر نے خود اضافہ کیا تھا۔

تاہم یہ کہنا پڑے گا کہ زار کی جاری کردہ اصلاحات تیزی سے جڑیں پکڑنے
لگیں اور مخالفین کے مقابلے میں نوخیز طبقۂ امراء کی روز افزوں تعداد جسے
اس نے اپنے جوش و ولولے سے سرشار کر دیا تھا اس کی ہم نوا ہونے لگی ۔
اور اس طرح تمام انتشار جمعیت میں بدلنے لگا ۔ بایں ہمہ پیٹر اس راز سے
بخوبی واقف تھا کہ میرے عہدِ حکومت کی کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار اس
بات پر ہے کہ سویڈن کے ساتھ کامیابی سے جنگ کی جائے ۔ وجہ یہ تھی کہ زار ۱۴
نے روس کو یورپ کی جس پٹڑی پر ڈال دیا تھا وہ اُس پر تبھی گامزن رہ سکتا
تھا کہ اسے مغربی دُنیا کے ساتھ تجارتی اور دوسرے عمدہ مواصلاتی راستے ملیں
یہ شاہراہ بحیرۂ بالٹک کے ساحل سے تھی جو اس وقت سویڈن کے قبضے میں
تھا ۔ اس مقصد سے پیٹر نے ۱۷۰۰ء میں پولینڈ اور سیکسنی کے بادشاہ اگسٹس
کے ساتھ معاہدہ کیا اور اپنی فوجیں اہلِ سویڈن کے خلاف کھڑی کر کے بالٹک
میں سویڈن کے قلعۂ نروا کا محاصرہ شروع کر دیا ۔

چارلس دوازدہم اس وقت سویڈن کا بادشاہ تھا اور کسی کو خبر نہ تھی کہ یہ
نوجوان جو بظاہر ایک عجیب اور خودسر سا نظر آتا تھا فنِ سپہ گری کا جبلّی ماہر تھا
مگر یہ حقیقت پیٹر پہ بہت جلد واضح ہو گئی ۔ نروا کے قریب میدانِ کارزار میں کھڑی روسی

فوجوں پر چارلس نے سخت طوفان برفباری کے وقت دفعتہً حملہ کر دیا۔ پیٹر کی نوآموز اور ہنگامی حالات میں تربیت دی ہوئی باضابطہ فوج بے خبری کے عالم میں اس زد کی تاب نہ لاسکی اور تتّر بتّر ہوگئی۔ ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور ایک پل کو پار کرتے وقت افراتفری میں بہت سے آدمی کچلے گئے۔ زار کے پرانے تربیت یافتہ "پریو براژنگی" "سیمیو ناوسکی" دستے البتہ بہادری کے ساتھ لڑتے رہے اور تنظیم کے ساتھ پسپا ہوئے پھر بھی روسیوں نے شکست فاش کھائی۔ پیٹر کا سارا توپخانہ اور سامان رسد چارلس کے ہاتھ آیا۔

پیٹر کے لیے یہ ایک نہایت اضطراب انگیز گھڑی تھی۔ قدامت پسند روسیوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس کی اصلاحات کو اس المیہ کا سبب گردانا نوجوان زار کا وقار سخت مجروح ہوا۔ لیکن چارلس سے بھی سخت غلطی ہوئی۔ اگر اس نے بقیہ روسی فوج کا تعاقب کیا ہوتا تو بہت ممکن تھا وہ ماسکو بھی فتح کر لیتا مگر اس نے پیٹر کے حلیف آگسٹس سے ٹکر لی اور پولینڈ اور سیکسنی کے ساتھ لامتناہی جنگوں میں الجھا رہا۔ آخر ۱۷۰۷ء میں آگسٹس کو شکست دے کر وہ ایک بار پھر روس کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔

نروا کے حادثے نے پیٹر کا حوصلہ پست نہ کیا۔ اس کی حوصلہ شکنی ممکن ہی نہ تھی۔ چارلس کو پولینڈ میں الجھائے رکھنے کے لیے اس نے آگسٹس کی مدد کے لیے روپیہ، غلّہ اور ایک مختصر سی معرکہ آرا فوج بھیجی۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ نئی فوج تیار کرنے لگا اور اس کی تربیت اس تجربے کے مطابق کی جو اسے نقصان عظیم کے بعد حاصل ہوا تھا۔ تین سو نئی توپیں بنائی گئیں۔ تانبا جس سے یہ توپیں بنی تھیں روس میں نایاب تھا اس لیے کلیساؤں کے گھنٹے کام میں لائے گئے۔ دو سال میں نئی فوج کیل کانٹے سے لیس ہوگئی۔ چارلس ابھی پولینڈ میں مصروف تھا۔ پیٹر

بحیرۂ بالٹک کے جنگی تھیٹر پر نمودار ہوا ۔ سویڈن کی چھوٹی چھوٹی فوجوں کو ہرایا ۔ تیزی کے ساتھ چند قلعے تعمیر کیے اور ۱۷۰۳ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کی تعمیر میں لگ گیا ۔ اب اس نے ہالینڈ اور انگلستان سے حاصل کردہ جہاز سازی کے علم اور تجربے کا بھی پورا پورا استعمال کیا ۔ جھیل لڈوگا پر جسے دریائے نیوا نے سمندر سے ملا دیا تھا جہاز سازی کے کارخانے قائم ہوئے اور وہاں سے بحری جہاز انتہائی تیزی کے ساتھ تیار ہو کر نکلنے لگے۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نیوا کی دلدل پر پیٹرزبرگ آباد کرنے کے لیے کس قدر محنت اور سرمایہ درکار تھا ۔ پھر آگسٹس کی امداد، نئی فوج کی تنظیم و تربیت اور بحری جہازوں کی ساخت پر کتنا کچھ خرچ ہوا ۔ ٹیکسوں کی ادائیگی اور لاکھوں انسانوں کو بالٹک بھیجنے کے مصارف نے روس کا خون چوس لیا تھا ۔ مگر ساحل بالٹک کا قبضہ ملک کی اہم ضرورت تھی ۔ پیٹر جانتا تھا کہ چارلس اسے جان کی بازی لگائے بغیر نہ چھوڑے گا ۔ روسیوں کی اکثریت اس راز کو سمجھنے سے قاصر تھی ۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ان کی زندگیاں مصائب سے گھری ہوئی ہیں ۔

دریائے ڈان کے کاسکوں اور دہقانوں نے بغاوتیں کیں اور پیٹر نے بڑی مشکل سے انہیں دبایا ۔ پوری سلطنت متزلزل تھی ۔ ایسی نازک گھڑی میں چارلس پھر روس سے آ اُلجھا ۔ پولینڈ سے سویڈن کی فوجیں جنوبی روس کی طرف بڑھیں ۔ چارلس کا خیال تھا کہ ینپر یا یوکرین کے کاسک بھی سویڈن کے حلیف بن کر پیٹر کے خلاف بغاوت کریں گے ۔ مگر ایسا نہ ہوا اور اکثریت نے روس کا ساتھ دیا اس اثنا میں پیٹر بھی بہت سی فوج کے ساتھ جنوب میں جا پہنچا ۔ ۱۷۰۹ء میں یوکرین کے روسی قلعہ پولٹاوا کے پاس دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئیں ۔

پیٹر کے لیے یہ گھڑی پوری زندگی کی بازی تھی ۔ اس نے فوج کی کمان خود سنبھالی ۔ لڑائی سے پہلے اس نے اپنی سپاہ کو نصیحت کے طور پر حکم دیا :

"پیٹر کی حفاظت کی فکر نہ کرنا رُوس کا خیال رکھنا"۔

چارلس نے حسب معمول جرأت و دلیری کے ساتھ فوجوں کو جنگ پر ابھارا گھمسان کا رن پڑا اور خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ پیٹر کے ہیٹ کو سویڈن کے کسی سپاہی کی گولی چھید گئی۔ مگر اس مرتبہ چارلس نے مات کھائی۔ پیٹر کی فوج ایک آہنی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔ سویڈن والوں کو شکست فاش ہوئی۔ فوج کی اکثریت نے ہتھیار ڈال دیے چارلس خود زخموں سے چُور ایک ڈولی پر پڑ کر ترکی پہنچا۔ اس رات پیٹر نے سویڈن کے گرفتار شدہ افسروں کو کھانے پر مدعو کیا۔ ان کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آیا۔ تفنّن کے بطور بولا کہ تم نے مجھے بہت کچھ سکھایا، اس لیے استاد سمجھ کر میں تمہارا جامِ صحت پیتا ہوں۔

سویڈن کی فوجی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی یوں معاندانہ جھڑپیں سالہاسال تک چلتی رہیں۔ لیکن سویڈن کو ہر موقع پر تازہ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اہم ترین شکست وہ تھی جو نئے روسی بحریے نے ۱۷۱۴ء میں سویڈن کے طاقت ور جنگی بیڑے کو دی۔ بلا آخر سویڈن نے مقابلہ ترک کردیا اور ۱۷۲۱ء میں بالٹک کا تمام علاقہ موجودہ استھونیا، لٹویا سمیت اور فن لینڈ کا جنوبی حصّہ مع ری برگ شہر کے جو اب وائی پوری کہلاتا ہے روس کے حوالے کردیا۔

پیٹر نے ترکی اور ایران سے بھی معرکہ آرائی کی۔ مگر ۱۷۱۱ء میں ترکی کا روس پر حملہ زار کے لیے منحوس ثابت ہوا۔ دریائے پرت پر اس کی فوجوں نے منہ کی کھائی اور خود گرفتاری سے بال بال بچا۔ پیٹر کو سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اسے خوب اندازہ تھا کہ ایک دن بحرۂ اسود بھی ملک کے لیے بحرۂ بالٹک کی سی اہمیت رکھے گا البتّہ ایران کے ساتھ جنگ کرکے وہ بحرۂ خزر کے مشرقی ساحل اور ٹرانس کاکیشیا میں واقع باکو پر قابض ہوگیا۔

پیٹرزبرگ جو روسیوں کی ہڈیوں پر تعمیر ہوا تھا۔ شمالی دلدل سے ہر روز نئی آن بان کے ساتھ اُبھرتا رہا۔ پیٹر کو ماسکو بہت ناپسند تھا کیونکہ اس سے پرانی فضا اور کریملن میں سوفیہ کے معاونین کے ہاتھوں اس کے ننھیالی عزیزوں کے قتلِ عام کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ پیٹرزبرگ اس کی اپنی دماغی اختراع کا نتیجہ تھا۔ یہ اس کا ساختہ پرداختہ اور اس کی اصلاحات کا نشان ہونے کی وجہ سے اسے بے حد عزیز تھا اس شہر کی چوڑی شاہراہیں، نہریں، امراء کے جرمن اور ولندیزی طرز کے سنگین محل اور سڑکوں پر ٹھٹھ کے ٹھٹھ غیر ملکی ملاحوں کو دیکھ کر اسے یہ معلوم ہوتا گویا میں نے اپنے ہاتھوں سے یورپ کی جدید ترقیات کو سرزمین روس میں منتقل کر لیا ہے۔

۱۷۱۴ء میں اس نے اپنی سکونت اور سرکاری دفاتر نئے دارالسلطنت میں منتقل کر لیے۔ ۱۷۲۱ء میں سویڈن کے ساتھ صلح ہو جانے پر زار کے قدیم لقب کے ساتھ "شہنشاہِ کل روسیاں" کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ یہ تقریب بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی۔ پیٹرزبرگ کی نیم منجمد رات میں آتشبازی کی کثرت سے برف رنگا رنگ گلزار بن گئی۔ تحسین و آفرین اور مسرت کے نعرے لگانے والے، یونانی صنمیات کے سوانگ بھرے ہوئے سنہری رتھوں پر سوار لوگوں سے راستے پٹے پڑے تھے۔ پیٹر جانتا تھا کہ اس کی محنتیں کارگر ہوگئیں۔ اس کے چاروں طرف پرجوش معاونین جمع تھے اس کے نام کی گونج سارے یورپ میں تھی۔ سلطنت میں امن وامان تھا۔ پھر بھی وہ بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ غیرممالک کے ساتھ تجارت کو مزید فروغ دینا ایک اہم ضرورت تھی۔ روس کی اقتصادی ترقی پر توجہ دینا بھی لازمی تھا کیوں کہ متواتر لڑائیوں نے اس کا خزانہ خالی کر دیا تھا۔ ان تقاضوں کے پیشِ نظر وہ حسبِ معمول شدومد کے ساتھ مصروف کار رہا۔

۱۷۲۴ء کی خزاں میں اس نے پیٹرز برگ کے ساحل سے دور طوفانی سمندر میں چند سپاہیوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھا۔ انھیں بچانے کے لیے وہ بے تامّل بھاگا پانی میں شرابور ہوجانے سے اسے سردی کا اثر ہوا جس سے وہ جاں بر نہ ہوسکا اور بالآخر جنوری میں ۱۷۲۵ء میں راہی عدم ہوا۔

پیٹر کی اصلاحات خوب پھل لائیں اور سلطنت روس یورپ کی طرح سُرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی۔

پیٹر کے فوری جانشینوں کا عہد جن میں سے بیشتر ملکہ تھیں۔ سجیلی ٹوپیوں، بانکپن شان و شکوہ، درباری سازشوں اور شاندار فتوحات کا دور تھا۔ روس کی طاقت وعظمت اوج پر تھی۔ یورپ کے سیاسی معاملات میں اس کی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی یہ زمانہ پیٹر کی بیٹی الزبتھ کا تھا جس نے ۱۷۴۱ء سے ۱۷۶۱ء تک حکومت کی اور بالخصوص زارینہ کیتھرائن کا جو ۱۷۶۱ء سے ۱۷۹۶ء تک حکمران رہی۔ روسی دربار نے پہلے تو وہ طرز اپنایا جو شاہانِ فرانس کے دربار کا تھا اور پھر دادِ عیش دینے میں اس سے بھی سبقت لے گیا۔ پیٹرز برگ اور گرد و نواح میں یورپی نمونے کے ایک سے ایک بڑھ کر شاندار محل تعمیر ہوئے اور انہیں یورپی فنونِ لطیفہ کے خزانوں سے معمور کرنے میں بے حد و حساب اسراف سے کام لیا گیا۔ روسی اُمراء جو پیٹر کے عہد میں داڑھیاں منڈوانے سے اتنا ہچکچاتے تھے اور اب پورے فرانسیسی نمونے بن گئے۔ بعض تو فرانسیسی زبان بھی اپنی مادری زبان سے بہتر بولنے لگے۔ ہر طرف فضول خرچی کا دور دورہ تھا چھوٹی کے درباری اُمراء زارینہ کیتھرائن کے اعزاز میں ایک ضیافت دے کر لاکھوں روپیہ خرچ کر ڈالتے تھے۔ وہ ان تقریبات میں تمثیلی مناظر پیش کرنے کے لیے پوری تھیٹر کمپنیاں تیار کرواتے تھے۔ گلاب کے پھولوں سے بھرے ہوئے جہاز کرایہ دے کر فرانس

سے منگواتے اور ان خاص موقعوں پر اپنے گھروں کو سجاتے تھے۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پیٹرز برگ کی سرد آب وہوا گلاب پیدا نہ کر سکتی تھی۔ وہ بے تحاشا قمار بازی جو یورپ کا معمول بن چکی تھی روس میں بھی لائی گئی اور خوب پروان چڑھی۔ محلات میں یہ سب کچھ ہوتا رہا اور عوام ٹکڑوں کو ترستے رہے۔ مگر انہی نسوانی مزاج، جواہر پوش امراء اور شرفا میں سے اعلیٰ قابلیتوں کے مدبر اور سپہ سالار بھی نمودار ہوئے زارینہ کے ایک مقرب شہزادہ پوٹم کن نے نو مفتوح بحیرہ اسود کے ساحلوں کو اعلیٰ تنظیم سے آباد کیا۔ کسی قدر خبطی بوڑھا کاؤنٹ سوووراف فن سپہ گیری کے بہترین ماہر کی حیثیت سے میدانِ نبرد میں ایک نادر طریقۂ جنگ کا موجد ہوا اپنے شیدائی سورما سپاہیوں کی مدد سے اس نے ترک، فرانسیسی اور دوسری فوجوں کو تہس نہس کر کے عظیم الشان فتوحات حاصل کیں۔ حق یہ ہے کہ ماہرین اس کے حربی منصوبوں کا اب بھی مطالعہ کرتے ہیں "سوووراف آرڈر" سوویٹ فوج میں آج تک اعلیٰ ترین اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

انیسویں صدی میں یہ نقشہ بدل گیا۔ زار، شہنشاہ اور گرینڈ ڈیوک کے (جن کا لقب اب شاہی خاندان کے ارکان کے لیے مختص ہو گیا تھا) یورپی حکمرانوں کی طرح نہایت معمولی اور سادہ زندگی بسر کرنے لگے۔ مثال کے طور پر شہنشاہ الیگزینڈر سوم (متوفی ۱۸۹۴ء) کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی پتلون میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ زارینہ کیتھرائن کے پُرشوکت محلات میں قدیم جاہ و جلال اور شانِ تجمل کا فقط سرکاری رقص کی تقاریب اور دوسرے اہم موقعوں پر بھی مظاہرہ کیا جاتا تھا۔

روسی معاشرے میں یورپی تہذیب اب محض سطحیت، نمائش اور اسراف کی نہ رہی۔ بالائی طبقے کے دل و دماغ اور اخلاق و اطوار کی گہرائیوں میں

پہنچ کر یہ قدیم روسی روایات اور طرزِ زندگی کے ساتھ گھل مل گئی اور ایک حقیقت پسند درخشاں روسی ثقافت پیدا ہوئی۔

روسی ادب بڑی سُرعت سے معرضِ وجود میں آیا، گویا راتوں رات اس کا شجر سنہری زمانے کی صورت میں بار آور ہوا۔ ایک پوری صدی تک اس کا یہ عروج قائم رہا۔ مزید برآں ذہانت، جدّتِ تخیّل، لطافت اور شستگیِ الفاظ دیگر ممالکِ یورپ کے اُنیسویں صدی کے ادب پر سبقت لے گیا۔ ۱۸۲۰ء کے بعد الیگزنڈر پشکن نامی ایک مفلس سردار افسرالشعراء ہوا۔ اس کی پاکیزہ شاعری روسیوں کے لیے وہی مقام رکھتی ہے جو شیکسپیر کی انگریزوں کے لیے اور گوئٹے کی جرمنوں کے لیے۔ اس کے گرد اسی جیسے اعلیٰ پائے کے سخنوروں کا ہجوم تھا۔ صدی کے وسط میں جو گل ترجنیف کاؤنٹ ٹالسٹائی اور دوستووسکی جیسے بلند رتبہ روسی افسانہ نویس پیدا ہوئے۔ ان کی تصانیف تمام مہذب زبانوں میں ترجمہ ہو جانے کی بدولت ساری دنیا ان سے آشنا ہے۔ ادب کے علاوہ روس نے بے مثال رقص گاہیں اور موسیقی بھی پیدا کی۔ چائیکووسکی، رمسکی کورساکاف، موسورگسکی اور دوسرے موسیقاروں کی راگنیاں امریکہ میں روزانہ گائی بجائی جاتی ہیں اور ہر امریکی ان کی دھنوں کو الاپتا ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ روسی یونیورسٹیوں نے جو علم و ہُنر کے عظیم مرکز ہیں، کیمیا، نباتیات، حیوانیات اور دوسری سائنسوں کے ایسے ماہرین تیار کیے کہ ان کے نام دنیا کے چوٹی کے سائنسدانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ فی الواقع روسیوں نے بڑی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ صرف ایک صدی کے اندر روس نے دنیا کے مخزن فنون اور تخلیقِ فکر میں ایسا بیش بہا حصّہ دیا کہ اس کا شمار اہم ترین اقوام میں ہے۔ اُنیسویں صدی میں روس کی وہ تمام چمکتی دمکتی ثقافت براہ راست پیٹرِ اعظم

کی ان اصلاحات کا ثمرہ تھی جن سے اس نے اپنے اہلِ وطن کو مغربی طرزِ معاشرت سیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے گا کہ اسی کی بدولت اُنیسویں صدی کا رُوس داخلی خرابیوں میں مبتلا ہوا۔

۱۸۶۰ء تک جدید مغربی طرز کی روسی ثقافت سے روس کا مختصر اعلیٰ طبقہ یعنی اُمراء، تاجر، پیشہ ور اور متموّل شہریوں نے ہی استفادہ کیا تھا دہقانوں کو جو آبادی کی اکثریت تھے اس نے چھُوا تک نہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے مسکوویا کی جہالت جیسی پہلے تھی وہ بدستور ان پر طاری رہی اور وہ ایسی فلاکت میں گزر کرتے رہے جو غلامی کے برابر تھی یوں کہیے کہ وہ اُمراء کے قریباً زرخرید ہو گئے تھے۔

"وحشت ناک" آئوان کے عہد میں اور اس سے قبل بھی روسی دہقانوں کی اکثریت آزاد تھی۔ اس وقت مسکوویا کی معاشرت میں یہ اہم اصول کارگر تھا کہ حکومت یا زار کے علاوہ صرف وہ شخص ہی زمین کی ملکیت یا عارضی اجارہ داری کا مجاز تھا جو حکومت کی خدمت بجالائے۔ زمین کی غیر مشروط نجی ملکیت جو یورپ میں مروّج تھی روس میں اس کا نام ونشان نہ تھا۔ مسکوویا کا پورا معاشرتی نظام اسی ہی خاص اصول پہ کار فرما تھا۔ اُمراء جاگیروں کے مالک تو تھے مگر اس کے عوض انہیں ملک کی حفاظت کے لیے لڑائیوں میں حصہ لینا ہوتا تھا یا سول افسروں کی حیثیت سے خدمات بجا لاتے تھے۔ ان کی یہ ملازمت زندگی بھر کے لیے تھی اور اس کے لیے انہیں سوائے ان جاگیروں کی آمدنی کے دوسرا کوئی مشاہرہ نہ ملتا تھا۔ دہقان زمین کاشت کرتا تھا اور ماحصل سے اپنی گزر اوقات کے علاوہ حکومت کو جنس یا مشقت کی صورت میں ٹیکس بھی ادا کرتا

تھا ۔ اس اصول کی بناء پر جب کوئی دہقان کسی امیر کی جاگیر میں رہتا تو وہ اس امیر کا کام بھی کرتا تھا ۔ کھیتوں میں کام کے وقت اسے اپنی سکونتی جاگیر چھوڑنے کی اجازت نہ تھی ۔ البتہ فصلیں اکٹھی ہو جانے کے بعد وہ کسی اور جاگیر پر منتقل
ہو سکتا تھا ۔ ۱

جنگ کے زمانے میں دہقانوں پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے تھے کیونکہ سردار ۱۲۱
کو اپنے لیے اور اپنے سپاہیوں کو سامانِ حرب مہیا کرنے کے لیے بہت خرچ درکار ہوتا تھا ۔ اس لیے بعض اوقات کسانوں کو بھوکا رہنا پڑتا ۔ مگر وہ جانتے تھے کہ خود جاگیر داروں کی زندگی بھی آسان نہ تھی اور انہیں بڑے مصائب سے واسطہ تھا ۔ مسکوویا کی لامتناہی جنگوں میں نوجوان شہزادے، امراء اور عام شرفاء ہزاروں کی تعداد میں تہِ تیغ ہوئے ۔ سول کی ملازمتیں جن پر زاروں نے انہیں لگایا وہ بھی کچھ کم خطرناک اور سہل نہ تھیں ۔ اس بنا پر کسانوں کو احساس ہوا کہ اس عجیب و غریب سوشلسٹ طریقے میں انصاف کے بنیادی اصول کار فرما ہیں ۔ مسکوویا والے دوسروں کے خون پر پلنے والی جونکیں نہ تھیں سب کام کرتے اور خدمت بجا لاتے تھے ۔

مگر آخر میں یہ طریق بھی نہ چلا ۔ زار آئوان کی وفات کے بعد ہزاروں کسان باہمی جنگ و جدل سے برباد شدہ علاقوں سے بھاگ گئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وسیع جاگیریں غیر مزروعہ رہ گئیں اور مسکوویا کا خزانہ خالی ہونے لگا ۔ اب زار مجبور ہو گئے کہ کسانوں کو زمینوں کے ساتھ وابستہ کریں یعنی ان کا ایک جاگیر سے دوسری میں منتقل ہونا روک دیں ۔ اس اقدام نے کسانوں کو غلام تو نہ بنایا، ان کے حقوقِ شہریت قائم رہے مگر ان کی آزادی ضرور سلب ہو گئی ۔ انہیں جاگیروں پر کام کرنے کے لیے مجبور کیا گیا اور وہ نیم آزاد یا زرعی غلام کی حیثیت اختیار کر گئے ۔

پیٹر کی وفات کے بعد ان کی حالت اور بھی تباہ ہوگئی۔ پیٹر کا کوئی بیٹا زندہ نہ رہا تھا۔ صرف دو نابالغ پوتے تھے۔ جو بعد میں پیٹر دوم اور پیٹر سوم کے لقب سے تھوڑے عرصے کے لیے حکمران ہوئے۔ جانشینی کا کوئی مکمل قانون نہ تھا۔ اس لیے چند سال تک طوائف الملوکی کا دَور دورہ رہا۔ بیجیلی ٹوپیوں اور اصراف کا یہ زمانہ ذلیل ترین درباری سازشوں کا زمانہ تھا۔ امراء گروہ در گروہ کبھی خاندان رومناف کی ایک خاتون کی مدد کو اٹھتے کبھی دوسری کو اُبھارتے کہ وہ شہنشاہ یا ملکہ کا تخت اُلٹ کر اس پر قابض ہو جائے۔ امراء بالخصوص شاہی محافظ سپاہ کے ان نئے دستوں میں شامل ہوئے جو پیٹرزبرگ کے نواح میں متعین کیے گئے تھے۔ اور یہی امراء کے وہ فوجی دستے تھے۔ جو ۱۲۲
کچھ عرصے تک زاروں کو بنانے اور بگاڑنے کا ذریعہ ہوئے۔

اپنی قوت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے امراء نے اپنے بنائے ہوئے بادشاہوں سے خواہ مخواہ بہت سے حقوق منوا لیے یہ ناروا مراعات دہقانوں کے لیے سم قاتل ثابت ہوئیں۔

۱۷۶۲ء میں شہنشاہ پیٹر سوم کے حکم سے امراء پر سے تا حیات ملازمت کی پابندی اڑا دی گئی اور خدمت کرنا یا نہ کرنا ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی شہنشاہ نے یہ امید ظاہر کی کہ وہ ملک کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ درحقیقت یہ کہ انہیں نے کیا بھی، قبل ازیں حقوق ملکیت یا اجارہ داری مکمل طور پر امراء کی ذاتی املاک بن چکی تھیں۔

مزید برآں امراء کی ان جاگیروں پر بسنے والے دہقانوں کو حقوق شہریت سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ اب جاگیرداروں کو یہ حق بھی ہوگیا کہ مزارعین سے جتنا چاہیں کام لیں اور موت سے کم ہر قسم کی جسمانی سزا یا سائبیریا میں

جلا وطنی اور دوسری سزائیں دیں۔ پہلے دہقانوں کی خرید و فروخت نہ ہو سکتی تھی وہ زمین کے مالکوں کے تبدیل ہونے سے ہی ایک سردار سے دوسرے کے تصرف میں جا سکتے تھے۔ مگر اب دہقانوں کی فروخت قانوناً جائز قرار دی گئی۔ انسان ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ علانیہ برسر عام نیلام ہوتے یا جوئے میں ہار دیے جاتے۔ اکثر اوقات خاندان ٹکڑوں میں بٹ جاتے یعنی شوہر کہیں بکتا اور بیوی یا بچے کہیں اور۔ اس طرح روسی آبادی کی اکثریت اُمراء کے غلاموں میں تبدیل ہوگئی اور خود جاگیردار سابقہ بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوکر اپنے غلاموں کی تکلیف اور محنتوں سے بے نیاز بے فکر زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دہقانوں کی حالت جو سرکاری زمینوں پر تھے بہتر رہی اور ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ علاوہ بریں کاسک قبیلے آزاد ہی رہے مگر یہ سب محض ایک حصّہ تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان غلام دہقانوں کو ملکی تحفظ کا بھی بہت سا کام کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ یورپی افواج بڑھتی گئیں امراء تو اس زمانے میں بھی جب خدمت لازمی تھی روس کو حسب ضرورت فوج بہم پہنچانے سے قاصر رہتے تھے۔ اس لیے حکومت نے مدّتوں پہلے بڑی تعداد میں دہقانوں کی بھرتی شروع کر رکھی تھی اور وہی اب فوج کا جزوِ اعظم تھے۔

دہقان اس تمام ردّ و بدل پر خاموش نہ رہے۔ سولہویں صدی میں جب سے وہ زمینوں کے ساتھ وابستہ کر دیے گئے۔ انھوں نے بغاوتیں کیں جو بعض اوقات بڑی شدت اختیار کرگئیں۔ مگر اٹھارہویں صدی کی پے در پے ناانصافیوں اور ظلم نے تو انہیں ایسا برانگیختہ کیا کہ انتہائی ہیجان اور سخت شورش برپا ہوئی زارینہ کیتھرائن کے عہد میں دہقانوں نے بہت بڑی بغاوت ۱۷۷۲ء میں ملک کے

مشرقی حصے میں کی اس کا قائد ایک دکانک یمل یان پگاچیاف نامی تھا۔ اس نے حکومت کو نشانہ نہ بنایا کیونکہ اس وقت عوام کی نگاہ میں بادشاہ قریباً دیوتا کی حیثیت رکھتا تھا۔ پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے اس نے یہ چال بھی چلی کہ قتل سے بچ نکلنے والے شہنشاہ پیٹر سوم ہونے کا دعویٰ کیا (اگرچہ حقیقت میں پیٹر سوم معزولی کے بعد قتل ہوگیا تھا) باغی اپنے تمام مصائب کے لیے امراء اور جاگیرداروں کو ذمّہ دار ٹھہراتے تھے۔ دہقانوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کلہاڑیوں، بندوقوں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح امراء کے خاندانوں پر پل پڑے۔ اُنھیں تہ تیغ کیا۔ جاگیروں کو لوٹا جلایا اور زار پیٹر سوم کے نام سے احکام جاری کر کے زرعی غلامی باطل قرار دے دی۔ دریائے والگا کے کنارے استراخان سے کازان تک کا تمام وسیع و عریض علاقہ شعلوں کی نذر ہوا۔ کیتھرائن کو فوجوں کی یہ بغاوت فرو کرنے کے لیے دو سال خون کی ہولی کھیلنی پڑی۔ خود پگاچیاف اور دوسرے سرغنے تختۂ دار پر کھینچے گئے۔

اس کے بعد قریباً نوّے سال تک زرعی غلامی کا طریقہ جاری رہا۔ اس دور کے تمام حکمراں زار اسے بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ مگر کئی ایک وجوہ کی بنا پر اسے ختم کرنے سے ڈرتے تھے۔

والیٹر، ڈائیڈرواٹ اور دوسرے فرانسیسی فلسفیوں کی قدردان ملکہ کیتھرائن بڑی روشن خیال خاتون تھی مگر اس کا تمام تر انحصار ان امراء پر تھا کیونکہ شاہی محافظ دستے نے اس کے نااہل، اجڈ اور ناپسندیدہ شوہر پیٹر سوم کو ختم کر کے اسے تخت پر بٹھایا تھا۔ جرمن نژاد شہزادی ہوتے ہوئے اسے حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ اپنے ۱۲۴
بیٹے پال کو (جو پیٹر کی صُلب سے تھا اور بعد میں پال اول کے نام سے حکمراں ہوا) محروم کر کے روس کی بادشاہت کرے مگر یہ بادشاہت شاہی محافظ دستے کے

بل بوتے پر اسے ملی تھی اس لیے دہقانوں کے معاملے میں وہ ضریبا" امراء کی مرضی کے خلاف جانے کی جرات نہ کرسکی ۔

جب بالآخر ۱۷۹۶ء میں پال اوّل کے تخت نشین ہونے کی باری آئی تو وہ نیم پاگل ہوچکا تھا ۔ دہقانوں کے متعلق اس کے ارادے بہت نیک تھے ۔ مگر پنج سالہ حکمرانی کی قلیل مدت میں اس نے ملکی معاملات کو بالکل درہم برہم کردیا ۔ محض حُبّ وطن کے جذبے سے سرشار ہوکر ۱۸۰۱ء میں ایک شب شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ اسے تخت سے دست برداری پر مجبور کرنے کے لیے محل میں داخل ہوا اس نے مدافعت کی اور مارا گیا ۔ اس کا بڑا بیٹا ایگزنڈر اوّل شہنشاہ بنا دیا گیا ۔

اس رات کے بعد رومانف خاندان کی جانشینی کا ضابطہ بن گیا ۔ امراء جن پر ایگزنڈر اوّل اور بعد میں آنے والے زاروں نے پوری طرح قابو پالیا ۔ پھر کبھی "درباری انقلاب" برپا کرنے کی جرائت نہ کرسکے ۔ ایگزنڈر نے ۱۸۲۵ء تک حکومت کی ۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے زیادہ روشن خیال ، عقلمند اور وسیع المشرب بادشاہ تھا ۔ یورپ میں وہ اپنی پرکشش شخصیت کے لیے مشہور تھا ۔ فی الواقع دنیا میں وہ پہلا شخص تھا جس نے جنگ کے خاتمے اور بین الاقوامی اختلافات کو پُرامن طریقوں سے حل کرنے کے لیے "لیگ آف نیشنز" (جمعیّت اقوام) کی تجویز پیش کی ۔ مگر یورپ کا ذہن اس کے لیے تیار نہ تھا اس لیے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ۔ ایگزنڈر نے زرعی غلامی کے قانون کو منسوخ کرنے کا محض تصور ہی نہیں باندھا بلکہ اس کے لیے عملی تجاویز بھی کیں ۔ لیکن عین اسی وقت نپولین شہنشاہ فرانس یورپ کی فتوحات کا عزم لے کر اٹھا ۔ اس کی مدافعت کے لیے ایگزنڈر کو متعدد شدید جنگوں میں الجھنا پڑا ۔ ۱۸۱۲ء میں نپولین روس پر حملہ آور ہوا اور ماسکو لے لیا ۔ اگرچہ بہت جلد ہی وہ روس سے نکالا گیا اور یہ ناکامی اس کی بربادی کا

پیش خیمہ بنی۔ پھر حالات نے پلٹا کھایا اور ۱۸۱۴ء میں الیگزنڈر فاتح کی حیثیت سے پیرس میں داخل ہوا۔ ان جنگوں کے دوران اور مابعد کے عرصے میں جو بحالی اور پنپنے کے لیے درکار تھا زرعی غلامی کے قانون کو توڑنے کا خیال ناممکن تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس اصلاح کے لیے بہت سے اقتصادی رد و بدل لازم آتے جو زمانۂ امن میں ہی کیے جا سکتے تھے۔ زرعی غلام آزاد کرنے پر روس کو بلا معاوضہ خدمات لینے کی بجائے مزدوروں کو نقد مزدوری دینی پڑتی۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس طرح بنایا جائے کیونکہ اس پر عمل درآمد سے سخت مالی پریشانی کا اندیشہ تھا۔

جب روس کے زخم مندمل ہوئے اور اسے کچھ چین ملا تو الیگزنڈر کی طبیعت بھی بدل چکی تھی۔ ذاتی غموں اور صدموں نے اسے دل شکستہ کر دیا تھا اور اصلاحات کے نفاذ کے لیے روحانی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اس کا عہد حکومت بہت شاندار تھا۔ نپولین پر فتح پانے سے وہ یورپ میں سب سے زیادہ قابل ستائش بادشاہ اور پسندیدہ ترین ہستی تھا۔ عالمی سیاست میں اس کی رائے نہایت وقیع خیال کی جاتی تھی۔ مگر اب کسی چیز سے اسے خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ مذہب و تصوّف کی گہرائیوں میں کھو گیا اور کہنے لگا کہ تاج شاہی میرے لیے ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ ۱۸۰۱ء کی اس رات کی یاد جس میں اس کا باپ زار پال قتل ہوا اس کے لیے سخت اذیت کا باعث تھی۔ کیونکہ گارڈ کے افسروں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ تو کر دیا تھا۔ اسے ان کے موقف سے اتفاق تھا کہ روس کی بہبود نیم پاگل بادشاہ کے ہٹائے جانے کی مقتضی تھی۔ مگر انھوں نے اسے یہ نہ بتایا تھا کہ معزول کر کے وہ اسے موت کے گھاٹ بھی اتار دیں گے۔ الیگزنڈر اس معاملے کا پس

منظر یاد کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ گویا وہ خود اپنے باپ کا قاتل بنا اور اس سے اسے بے حد اذیت پہنچتی۔ آج تک واضح نہ ہوسکا کہ آیا الیگزنڈر واقعی ۱۸۲۵ء میں جنوبی روس کے سفر کے دوران میں مرا۔ بعض مورخ یہ روایت مانتے ہیں کہ کسی سپاہی کی لاش کو بھیس بدل کر زار کے تابوت میں پیٹرزبرگ بھیج دیا گیا۔ الیگزنڈر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک زائر کسان فیودار کُزمک کے نام سے سادہ لباس میں پاپیادہ سائبیریا چلا گیا اور وہاں کئی سال تک افلاس وتنہائی میں رہ کر اپنے گناہوں سے استغفار کرتا رہا۔ اس عجیب وغریب شخصیت فیودار کُزمک کی (کیونکہ اس نام کا ایک بوڑھا سائبیریا میں تھا) بعض علامتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہی الیگزنڈر تھا۔

قصہ مختصر الیگزنڈر کا بھائی اور جانشین نکولاس اوّل بھی جو ۱۸۵۵ء تک حکمران رہا۔ بغاوت کے خوف سے غلامی کو منسوخ نہ کرسکا۔ غلامی کی سنگینیوں کے باوجود روسی عوام زار کے پرستار تھے علاوہ ازیں انھوں نے ملوکیت کے سوا کسی اور طرزِ حکومت کا نام بھی نہ سُنا تھا۔ امراء کسی بادشاہ کو پسند کرتے یا نہ کرتے مگر ان کی اکثریت بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ شہنشاہ کی وفادار رہی۔ اگرچہ جب سے ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلابِ عظیم آیا تھا۔ فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جنم لینے والے آزاد عوامی اور جمہوری خیالات روسی اعلیٰ طبقے میں بھی جگہ پا رہے تھے۔ الیگزنڈر کے زمانے میں بھی ایسے نظریات کے امراء موجود تھے جنھیں ملوکیت میں ظلم وتعدّی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور وہ روس میں نمائندہ حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھتے تھے۔ اگرچہ ایسے آزاد خیال اشخاص جن میں بہت سے شاہی باڈی گارڈ کے افسر بھی تھے، پہلے دو چار ہی تھے مگر رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ انھوں نے ایک خفیہ سوسائٹی

بھی قائم کرلی جو مبہم مگر نتیجہ خیز اصلاحات کا خواب دیکھتی تھی۔ جب الیگزنڈر مرا یا روپوش ہوا تو اس سوسائٹی نے کرنیل شہزادہ ٹروبٹسکوف اور دوسروں کی قیادت میں نکولس کو تخت نشینی سے روکنے اور انقلاب لانے کی سعی کی۔

فوجیں جو ان نوجوان انقلابیوں کا ساتھ دے رہی تھیں تعداد میں اتنی کم تھیں کہ یہ شورش بہ آسانی خونریزی کے بغیر فرو ہوگئی۔ پانچ سرغنے قتل ہوئے اور باقی سائبیریا میں جلاوطن کردیے گئے۔ روس کی تاریخ میں اس خالص انقلابی کوشش نے نئے بادشاہ کے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ بلند قامت، صاف گو اور دلیر نکولس نظم وضبط کا پابند اور شخصی حکومت کا دلدادہ تھا۔ روس میں مغربی طرز کی انقلابی تحریر کا وجود اس کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ وہ زرعی غلاموں کو آزاد کرنا چاہتا تھا مگر اسے خوف تھا کہ غلط فہمی پیدا کرکے یہ اعلان آزادی پگا چیاف کے نمونے کی وسیع دہقانی بغاوت کا پیش خیمہ
نہ بن جائے جس پر بالائی طبقہ کے آزاد خیالوں کی قیادت میں نئی انقلابی شورشیں ١٢٧
اضافہ کردیں اور روس بے معنی افراتفری اور لاقانونیت کا شکار ہوجائے۔ اس لیے اس نے اپنی سعی کو دہقانوں کی خرید و فروخت اور ان کے خاندانوں کے حصے بخرے کیے جانے کی ممانعت تک محدود رکھا۔ ایک اور قدم بڑھا کر اس نے روسی بالائی طبقے کے دل و دماغ سے مغرب کے فراخ اور انقلابی نظریات محو کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اخباروں، سوشل سائنس کی اشاعت اور یونیورسٹیوں میں اس کی تعلیم پر سخت قدغن لگائی۔ اس نقطۂ نظر سے اس کی حکومت کو رجعت پسندانہ کہنا چاہیے۔

پھر بھی نکولس ہی کے عہد میں وہ واقعات ہوئے جو آخر الامر غلاموں کی رہائی کا سبب بنے۔

پگا چیاف کی ۱۷۷۳ء والی مہیب بغاوت کے بعد روس میں دہقانوں کی کوئی بڑی شورش برپا نہیں ہوئی۔ چند ایک کو مستثنیٰ کر کے امراء اور ان کے پرستاروں کے تعلقات بُرے نہ تھے۔ دہقان امراء کی خدمت کرتے تھے اس لیے ان کا فرض تھا کہ خادموں کے ساتھ نرم سلوک روا رکھیں۔ مگر دہقان غلامی کی پابندی اور ذہنی قوتوں کی پامالی سے رنجیدہ اور پریشان ہوکر کام میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ روس کی زرعی پیداوار بھی اس کی صلاحیت سے کہیں کم تھی۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت نے سرکاری زمینوں کے مکین دہقانوں کو چند ایک سرکاری کانوں اور کارخانوں میں لگا دیا اور بعض صاحبِ ثروت امرأ نے بھی اس کی پیروی کی۔ لیکن تاجر اور خوشحال شہری جن کا کام نئے نئے صنعتی ادارے قائم کرنا تھا کارکنوں کے فقدان سے اس طرف کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔ کارکن ملتے بھی کہاں سے جب روسیوں کی اکثریت امراء کی غلامی میں تھی صنعتیں نہ ہونے سے روس کے پاس سرمایہ بھی قلیل رہا۔ بنک بہت کم تھے قوم کا اوسط طبقہ کچھ حیثیت نہ رکھتا تھا اور شہروں کی مجموعی آبادی محدود تھی۔

اس طرح اُنّیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں غلامی کی لاش کے بوجھ سے دبا ہوا روس مادّی ترقی میں مغربی یورپ کے ممالک سے بہت پیچھے رہ گیا۔ لطف یہ کہ مغربی ملکوں نے انہی پچاس سال کے اندر صنعتی دَور میں داخل ہوکر ترقی کی راہ میں بہت بڑا قدم اٹھایا۔ ایک صدی پیشتر پیٹر اعظم نے اپنی دلیرانہ سعی سے کھینچ تان کر روس کو مغربی علوم و فنون اور حرفت کی اعلیٰ سطح پر کھڑا کر دیا تھا۔ مگر غلامی کے موذی مرض نے اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ صنعت و حرفت کی ترقی میں روس اور مغرب کے مابین وہی فرق پھر پیدا ہو گیا جو عہدِ پیٹر سے پہلے تھا۔ ان حقائق کا انکشاف ۱۸۵۳ء میں کریمیا کی جنگ سے ہوا۔ جنگ کی وجہ روس اور ترکی کا ملکی

حدود اور دوسرے مسائل کے متعلق اختلاف تھا مگر جلد ہی انگلستان اور فرانس ترکی کے ساتھ مل گئے کیونکہ وہ بلقان میں روسی اثر و رسوخ سے ہراساں تھے۔ اس طرح نکولس کا مقابلہ طاقتور متحدہ حلیفوں سے آپڑا۔

انگریز اور فرانسیسی طاقتور بحری بیڑوں کے سائے میں تینوں اتحادیوں نے کریمیا میں مہم آزما جرار فوج اتاری اور روس کے بحری اڈے سیبٹاپول کا محاصرہ کرلیا۔ روسی بحریہ کے پاس صرف بادبانی جہاز تھے۔ دوسری طرف اتحادیوں کے بیڑے میں بڑی تعداد دخانی جہازوں کی تھی۔ اس سے انہیں اتنی قوت حاصل ہوئی کہ روسی بحری جنگ میں ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ انگریزی اور فرانسیسی توپ خانے اور دوسرا سامانِ حرب روسیوں سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ روس میں ماسکو سے پیٹرزبرگ تک فقط چار سو میل لمبی ریل کی سڑک تھی (برطانیہ میں ریل کی سڑکیں آٹھ سو میل لمبی تھیں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پچیس ہزار میل) ماسکو اور سیبٹاپول کے مابین سات سو میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے گھاس پھوس ڈال کر بنائی ہوئی سڑکیں تھیں جن پر بہار اور خزاں کی کیچڑ میں آلودہ لاغر گھوڑوں والے سیدھے سادے دہقانی چھکڑے قطار اندر قطار محصور شہر میں سامانِ رسد کھینچ کر لاتے تھے گر کر مرے ہوئے گھوڑوں کی لاتعداد لاشیں ان سڑکوں کے دونوں طرف پڑی ہوتی تھیں۔ مقابلے میں انگریز اور فرانسیسی اپنے وطن سے منزلوں دور ہونے کے باوجود بحری راستے سے اس تیزی کے ساتھ کمک اور رسد حاصل کر رہے تھے کہ روسی خشکی کے مختصر راستے سے بھی نہ پہنچا سکتے تھے۔ اس طرح سیبٹاپول کے محافظ سپاہ اور رسد دونوں کی کم یابی کا شکار ہوئے۔ اس حالت میں بھی وہ سال بھر مقابلے پر ڈٹے رہے۔ مگر آخر وہ دن آیا کہ اتحادیوں

نے زبردست حملے سے سیباسٹوپول سر کر لیا ۔ اور روس نے شکست کھائی ۔

اس شکست سے روسیوں کو سخت صدمہ ہوا ۔ ایک صدی پہلے کیتھرائن کی فوجوں کا یورپ میں مدِ مقابل نہ تھا ۔ ۱۸۱۲ء میں روس نے ناقابلِ تسخیر نپولین کی مدافعت کر کے اس کی بربادی کا سامان کیا تھا ۔ اور اب دور دراز سے بھیجی ہوئی محض ایک مہم آزما فوج کے سامنے انہیں پسپا ہونا پڑا تھا تمام فراخ دل روسی اس تباہی کا راز پا گئے کہ روس نے غلامی کی پیدا کردہ اقتصادی پسماندگی کی بدولت شکست کھائی تھی ۔

خامیوں کے باوجود نکولس ایک مخلص محبِ وطن تھا ۔ سیباسٹوپول کی شکست سے پہلے ہی اسے پوری طرح احساس ہو گیا تھا کہ غلاموں کو آزاد نہ کرنے کی وجہ سے یہ سب نقصان پہنچا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی موت بھی سردی لگنے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ مایوسی اور دلشکنی سے ۔

اس کا بلند قامت ، تنومند ، نیلگوں چشم منجھلا بیٹا الیگزنڈر دوم کے لقب سے تخت نشین ہوا ۔ مشہور روسی شاعر اور ہمدرد انسانیت ژوکوسکی سے تعلیم حاصل کرنے کی بدولت یہ نیا بادشاہ نرم دل اور وسیع المشرب تھا ۔ اس نے عزم کیا تھا کہ اس کا پہلا کام غلاموں کی آزادی ہو گا اس لیے حکومت کے روزِ اوّل سے ہی اصلاح کی تیاریاں شروع ہو گئیں ۔

اب روسی امراء بھی بدل چکے تھے اور ان کی کیفیت صدی کے آغاز کی سی نہ تھی ۔ بلاشبہ بہت سے ایسے بھی تھے جو خود غرضی کی وجہ سے اصلاح کے مخالف تھے ۔ پھر بھی ماحول میں تبدیلی تھی کیونکہ زار نکولس کی طرف سے سخت قدغن کے باوجود مشہور افسانہ نگار ترجنیف ، شاعر نکراساف اور بہت سے دوسرے مصنّفین خود غلاموں کے مالک ہوتے ہوئے روسی قوم کو وسیع المشرب

کی تعلیم دیتے رہے اور ان پر واضح کرتے رہے کہ غلام رکھنا وحشیانہ بے انصافی ہے۔ جنگِ کریمیا میں شکست نے بھی اچھی طرح آنکھیں کھول دی تھیں ہزاروں فراخ حوصلہ امراء علاوہ بریں اوسط طبقہ نے بڑے جوش وخروش سے الیگزنڈر کی اس اصلاح کی تائید کی۔

بعد ازاں تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ ۱۸۶۱ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے حبشی غلاموں کی آزادی سے دو سال پہلے روس میں بڑی سنجیدگی سے اس عظیم اصلاح کا اعلان کر دیا گیا۔

زار کے منشور سے زرعی غلامی منسوخ ہوگئی تمام دہقان آزاد قرار پائے امراء کا اپنے پہلے غلاموں پر کسی قسم کا قبضہ یا حق نہ رہا۔ اب دہقان روسی رعایا کے دوسرے افراد کی طرح عدالتوں ہی میں سزایاب ہو سکتے تھے۔ دہقانوں کو آزاد ہونے کے لیے کوئی فدیہ بھی نہ دینا پڑی۔

دہقانوں کو اراضی بھی ملی۔ امراء کی آدھی سے زیادہ زمینیں ان میں تقسیم کردی گئیں۔ سرکاری مقبوضات پر رہنے والے دہقانوں کو حکومت کیطرف سے زمین ملی۔ ہر بالغ مرد کو علاقائی حالات کے مطابق ۷ ، ۲ سے لے کر تیس ایکڑ تک زمین دی گئی بعد ازاں یورپی روس میں چھتیس کروڑ دس لاکھ ایکڑ زمین دہقانوں کی ملکیت میں آئی اور بقیہ اکیس کروڑ ایکڑ امراء کے پاس رہی۔ بیس کروڑ ایکڑ قابلِ زراعت اراضی اور بہت سی بنجر زمین حکومت کی ملکیت رہی۔

امراء سے لی ہوئی اراضی کی قیمت ادا کرنے کے لیے انہیں سرکاری قبالے لکھ دیے گئے جن کی ادائیگی دہقانوں کو سالانہ قسطوں کی شکل میں اُنچاس سال کی مدت میں کرنی تھی۔

الیگزنڈر اور اس کے وزراء کو خدشہ ہوا کہ امراء اور تاجر دہقانوں کی عزبت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی زمینیں دوبارہ خرید کر انہیں محروم نہ کر دیں، اس لیے زمین کو دہقانوں کی نجی ملکیت بنانے کی بجائے حکومت نے گاؤں کی دیہی پنچایت کو جو "میر" کہلاتی تھی دے دی۔ ہر چند سال بعد "میر" دہقان خاندانوں میں اس زمین کی از سر نو تقسیم اس طرح کرتے کہ جو کنبے اس اثناء میں بڑھ جاتے انہیں زیادہ حصہ دیا جاتا اور جو گھٹ جاتے انہیں کم۔ اگر کوئی دہقان کاشت کاری چھوڑ کر شہر میں بسنا چاہتا تو اسے لازم تھا کہ زمین "میر" کے حوالے کر دے، کسی اور کو بیچنے کا مجاز نہ تھا۔ ہاں دہقانوں کو یہ حق تھا کہ وہ کھلے بازار میں زمین خرید لیں جو ان کی نجی جائیداد بن سکتی تھی۔

اس عظیم اصلاح کے ساتھ روس کی زندگی میں تاریخ کا نیا باب کھلا۔ ان قبالوں کی شکل میں جو حکومت نے امراء کو جاری کیے ملک میں بڑا سرمایہ پیدا ہو گیا جسے لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس سرمائے نے ترقی کی رفتار ایسی تیز کی کہ روس نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ ریل کی سڑکیں تعمیر ہونا شروع ہوئیں اور ۱۹۱۴ء تک روس میں اُنچاس ہزار میل لمبا جال بچھا اور ملک ریاستہائے متحدہ امریکہ سے دوسرے نمبر پر آ گیا۔ صنعتوں میں بھی بڑی سُرعت سے ترقی ہونے لگی۔ ۱۸۵۰ء تک یہ وسیع مملکت کپاس کی صنعت سے بالکل خالی تھی۔ مگر ۱۹۱۴ء میں اس کے پاس نوّے لاکھ تکلے اور دو لاکھ پچاس ہزار کھڈیاں تھیں اور دنیا میں سوتی پارچات تیار کرنے والی یہ چوتھی بڑی طاقت بن گئی۔ ۱۹۰۰ء میں روس نے ساڑھے سولہ لاکھ ٹن دھات کی مصنوعات بنائیں۔ چودہ برس کے عرصے میں یہ مقدار اکتالیس

لاکھ ٹن تک پہنچ گئی ۔ دوسری صنعتوں میں بھی اسی طرح روز افزوں ترقی ہوئی۔ جب ۱۸۶۱ء میں روس نے کام شروع کیا تو عملی طور پر یہ تلاش تھا، پہلے ستر یا استی سال جو بے کار ضائع ہو گئے ان کی تلافی ۱۸۶۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کے ترپن سال میں ممکن نہ تھی ۔ ۱۹۱۴ء میں روس کی صنعت ریاستہائے متحدہ امریکہ تو کجا انگلستان اور جرمنی سے بھی بہت پیچھے تھی ۔ مگر اُنیسویں صدی کے آخر سے روس کے صنعتی ارتقاء میں امریکہ کے برابر تیز رفتاری پیدا ہوگئی۔

رُوس کی معاشرتی ترقی میں بھی یہی سرعت کارفرما رہی ۔ ۱۸۶۱ء کے بعد سے دہقانوں کو بھی دوسرے طبقوں کے ساتھ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کا حق ملا ۔ درس گاہوں کی تعداد خوب بڑھنے لگی اور شاندار نتائج نکلے ۔ ۱۸۶۱ء سے قبل اعلیٰ طبقے کے صرف چند لاکھ بچے ابتدائی سکولوں میں جاتے تھے ۔ ۱۸۸۱ء میں یہ تعداد گیارہ لاکھ اکتالیس ہزار ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں اکیاسی لاکھ سنتالیس ہزار تک جا پہنچی ۔ جس سے ثابت ہوا کہ کُل روسی بچوں کا معتدبہ حصہ تعلیم پا رہا تھا ۔ ۱۹۱۲ء میں ایک لاکھ سینتیس ہزار یونیورسٹی طلباء میں سے تقریباً آدھے دہقانوں ، کاریگروں اور مزدوروں کے بیٹے تھے۔ یہ بھی واضح رہے کہ تمام یورپی ممالک میں روسی یونیورسٹیاں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں ۔ غلامی باطل قرار دیے جانے سے امراء کے خصوصی استحقاق ختم ہو گئے البتہ انھیں شاہی محافظ دستوں میں خدمت بجا لانے کی فضیلت حاصل رہی مگر یہ اہم چیز نہ تھی ۔ بعض امراء بیگاری غلاموں سے محروم ہونے کی وجہ سے ان جاگیروں سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکتی تھی ۔ اس لیے رفتہ رفتہ انھوں نے زمینیں بیچ ڈالیں اور عوام کے ساتھ مل کر سرکاری ملازمت تجارت اور دوسرے پیشے اختیار کر لیے ۔ روسی معاشرہ تیزی کے ساتھ صحیح جمہوریت

پسند بن رہا تھا۔ اس ضمن میں یہ بتانا کافی ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں چند ایک اعلیٰ پائے کے روسی جرنیل نیز سپہ سالارِ اعظم ایگزیاف دہقان زادے ہی تھے۔

باوجود اس تمام ترقی کے شخصی اقتدار کی جڑیں کھوکھلی ہوچکی تھیں اور ملک ایک اور انقلاب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سوال اٹھتا ہے کہ کیوں؟ چند در چند امور اس کے ذمہ دار تھے۔ روسی آبادی کا پچھتر فی صد آزاد شدہ دہقان تھے اور یہ سب اپنی حالت سے غیر مطمئن تھے۔

۱۸۶۱ء میں جو زمینیں انھیں ملیں وہ کاشت کاری کے فرسودہ طریقوں کی وجہ سے ان کی گذران کے لیے ناکافی ہوئیں۔ دہقانوں کی اکثریت مفلوک الحال تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وقت کے ساتھ معمولی سی اقلیت کے سوا سب غریب سے غریب تر ہوتے گئے۔ اصل میں روس کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ ۱۷۲۲ء میں باشندوں کی تعداد ایک کروڑ پچیس لاکھ تھی۔ ۱۸۵۱ء میں چھ کروڑ ستر لاکھ ہوگئی اور ۱۹۱۴ء میں سترہ کروڑ ساٹھ لاکھ۔ اس طرح آبادی کے بڑھنے سے زمین ان کے لیے کم ہوگئی اور یہ نوبت ہوگئی کہ ۱۸۶۱ء میں جتنی اراضی ایک فرد کے پاس تھی ۱۹۱۴ء میں اس سے تین افراد کو گزر کرنا پڑی۔

ذرا گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حالات اتنے برُے بھی نہ تھے ۱۸۶۱ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصہ میں امراء نے اپنی بقیہ مملوکہ زمینوں کا نصف سے زیادہ حصہّ فروخت کر دیا تھا اس میں بہت سا خود دہقانوں نے حکومت کی امداد سے خریدا۔ اس سے ان کی مقبوضہ زمین کا رقبہ ستائیس فی صد بڑھ گیا۔ مزید برآں حکومت نے دہقانوں کی امداد کے لیے کئی دوسری تجویزوں

پر بھی عمل کیا اگرچہ بعض اوقات اس میں تاخیر واقع ہوئی۔ انہیں کاشت کاری کے بہتر طریقے سکھائے جن سے بہت کچھ فائدہ پہنچا۔ ۱۹۱۰ء تک دہقانوں کی زمینیں ۱۸۷۰ء کے مقابلے میں فی ایکڑ پچاس فی صد زیادہ پیدا وار دینے لگی تھیں اور ۱۹۰۳ء سے حکومت پانچ لاکھ افراد کو سائبیریا میں منتقل کرنے کے سالانہ مصارف برداشت کر رہی تھی۔ وہاں انہیں نئی زرخیز زمینیں دیں اور آباد کاری میں ہر ممکن مدد کی پھر ایک بڑی اہم بات یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے ہزاروں لاکھوں دہقان ہر سال کاشت کاری چھوڑ کر روس کی روز افزوں صنعت میں حصّہ لینے لگے تھے (گو اعلیٰ تعلیم یافتہ دہقانوں کا تناسب معزز پیشوں میں اب بھی کم ہی تھا۔)

مگر یہ تمام عناصر مل کر بھی کسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے نتائج کا ازالہ نہ کر سکے۔ کسان کنبوں میں ہر سال پچیس لاکھ بچّے پیدا ہوتے تھے۔ اس وجہ سے جب روس کے شہر دولت و ثروت میں کھیل رہے تھے۔ یورپی روس کی دیہاتی آبادی تنگی، افلاس اور پریشان حالی کی تلخیوں کا شکار تھی۔

زمین کے بھوکے دہقان امراء کی ملکیت میں بقیہ زمینیں دیکھ کر حسد سے جل جل اٹھتے تھے اور شکایت کرتے تھے کہ ۱۸۶۱ء میں زار نے ہمیں ان جاگیروں کا ایک حصّہ ہی دیا تھا۔ اسے چاہیے کہ باقی بھی دے دے۔ مگر حکومت محسوس کرتی تھی کہ امراء کو دوبارہ بے دخل کرنے کا اسے حق نہیں پہنچتا کیونکہ وہ اب غلاموں کے مالک نہ تھے صرف مالکانِ اراضی رہ گئے تھے۔ پھر یورپی روس کی قابلِ زراعت زمین کا صرف سترہ فی صد ان کی ملکیّت میں باقی تھا۔ اور بالفرض ان کی پوری جاگیریں دہقانوں میں تقسیم کر دی جاتیں تو کوئی بڑا فائدہ نہ ہوتا۔ اس سے فی کس ایک ایکڑ کے قلیل جزو کا ہی اضافہ ہوتا اور یہ کسی طرح نفع

بخش نہ تھا۔ دہقانوں کی اکثریت مسئلے کی تہ کو نہ پاسکی اور کئی موقعوں پر انھوں نے شورش برپا کر کے ہمسایہ مالکانِ اراضی کو بھگا کر یا مار کر ان کی جاگیریں آپس میں تقسیم کرلیں۔ مجبوراً پولیس یا فوج کو مزاحمت کرنی پڑتی اور سزائیں دی جاتیں اس پر دہقان اپنے تئیں مظلوم تصوّر کرتے اور سمجھتے کہ زار کو ان کی مدد کرنی منظور نہ تھی ان کے دلوں سے زار کی وہ اندھی پرستش جو انہوں نے غلامی کی سنگینوں میں بھی نہ چھوڑی تھی ختم ہونے لگی اور اندازاً ۱۹۰۰ء سے ہی ایک خاموش بے نیازی نے اس کی جگہ لے لی۔ زار کی حکومت ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگی۔ شخصی اقتدار کو اب روس کی بھاری اکثریت کی تائید حاصل نہ رہی۔ اس کے سوا اور بھی بہت کچھ ہوا۔

دہقانوں پر فقط زمین کی حرص غالب تھی، سیاست سے انہیں واسطہ نہ تھا ان کے برعکس وسیع المشرب امراء کا نیا صنعت کار طبقہ، پیشہ ور اور دانشور سیاسی اصلاحات کے طالب تھے۔ ۱۸۶۱ء سے اس نظریہ والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی کہ زار کی شخصی حکومت کی جگہ دستوری بادشاہت قائم ہونا چاہیے جس میں زار تخت نشین رہے مگر ایک منتخب پارلیمان قانون بنائے اور حکومت کا انتظام کرے۔ اس طرح پارلیمان کے ذریعے وہ ملکی حکومت میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ اخبارات بھی جو سابقہ زاروں کی نسبت الیگزنڈر دوم کے عہد میں زیادہ آزاد ہوگئے تھے۔ انہی خیالات اور نظریات کا مظہر بنا اور ملوکیت پر کڑی نکتہ چینی کرنے لگا۔

الیگزنڈر دوم نے رائے عامہ کے اس مطالبے سے کان بند نہ رکھے۔ اس نے بہ خوبی سمجھا کہ عوام کو حکومت میں حصّہ دینا ضروری ہوگا۔ اس لیے ۱۸۶۱ء کے فوراً بعد اس نے بہت سی اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اولاً یہ کہ بڑی تعداد میں تعلیمی ادارے کھولے۔ ہر طبقے کے نوجوانوں پر فوجی ملازمت کے دروازے کھول دیے اور فوج میں جسمانی سزا موقوف کر دی۔ اس نے اعلیٰ پیمانے کی نئی عدالتیں قائم کیں جن میں

جیوری یعنی ہر طبقے سے بھرتی کیے ہوئے کئی رکن ہوتے تھے۔ جیوری نظام "وحشتناک" آئوان کے عہد میں موجود تھا، مگر جب دہقان غلامی میں آئے تو ختم کر دیا گیا، سب سے اہم یہ اصلاح تھی کہ ۱۸۶۴ء میں الیگزنڈر نے بلدیے قائم کیے جن کی کارروائی میں زمیندار، امراء، تاجر اور دہقان برابر کے حصہ دار بنے۔ ان بلدیوں پر ہر ضلعے اور صوبے میں مدرسے، اور شفا خانے کھولنے، سڑکوں کی تعمیر اور زرعی مراکز قائم کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ الیگزنڈر کو امید تھی کہ اس طریقے سے عوام تدریجاً ملکی معاملات کا وہ تجربہ حاصل کر لیں گے جو انہیں پہلے نہ تھا اور یہ روس کو نمائندہ حکومت کے لیے تیار کر دے گا کیونکہ زار نے اپنی چشم بصیرت سے بھانپ لیا تھا کہ ایسی حکومت کبھی نہ کبھی قائم ہو کر رہے گی۔ ۱۸۸۱ء میں اپنی موت سے پہلے اس نے ایک قدم اور اٹھایا۔ یعنی ایک بل کا مسودہ تیار کیا گیا کہ عوام کے منتخب نمائندے ملکی مجلس شوریٰ میں جگہ پائیں (اس سے پہلے شہنشاہ کو تمام ملکی معاملات میں مشورہ دینے والی کونسل خود اس کے مقرر کردہ اعلیٰ افسروں پر مشتمل تھی) مگر المناک حادثات نے اس بل کو قانون نہ بننے دیا۔

فراخ دل روسیوں کی اکثریت نے الیگزنڈر کی ان اصلاحات کو گرم جوشی سے سراہا۔ مگر علم دوست طبقہ اور بالخصوص جوشیلے یونیورسٹی طلباء میں بہت سے اس خیال کے تھے کہ روسی دہقانوں کی ہلاکت کا واحد علاج یہ تھا کہ ارباب ثروت کے خزانے تقسیم کیے جائیں اور سوشلزم جس کا درس اس وقت یورپ کے بعض فلسفی دے رہے تھے ملک میں رائج کیا جائے۔ ان کے خیال میں یہ مقصد ایسے انقلاب سے ہی حاصل ہو سکتا تھا جو مروجہ نظام حکومت اور معاشرت کو یک قلم مٹا دے۔ ان انقلابیوں نے دہقانوں اور مزدوروں میں بھی اس کا چرچا کیا۔ مگر یہ سعی ناکام رہی۔ عوام کی اکثریت اب بھی زاروں کی اتنی دلدادہ تھی کہ وہ ان نئے مبلّغوں کو گھسیٹ

گھسیٹ کر لے گئے اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ مگر انقلابیوں نے حوصلہ نہ چھوڑا۔ بعض کی تو یہ رائے تھی کہ اگر عوام آمادۂ بغاوت نہ بھی ہوں تو دہشت پھیلا کر حکومت کے وزراء اور خود زار کو تہ تیغ کر کے انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ پھر حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد جب زمامِ اختیار انقلابیوں کے ہاتھ میں ہو گی تو عوام خود ہی سمجھ جائیں یہ سب کچھ ان کی بہتری کے لیے تھا۔

ایک خفیہ انقلابی گروہ موسوم بہ "جماعت عوامی نظریات" نے جس کی تعداد کوئی تین درجن اشخاص تھی الیگزنڈر کو ختم کرنے کے لیے کئی بار جان پہ کھیل کر دلیرانہ حملے کیے۔ یہ حملے اس کے گلیوں سے گزرتے وقت ہوتے۔ سفر کے دوران میں اس ریل گاڑی کو اڑانے کے لیے ریل کی سڑک کے نیچے سُرنگ کھود کر آتش گیر مادّہ بھر دیا گیا۔ زار کے سرمائی محل کا کچھ حصّہ بارود سے اڑا دیا گیا مگر وہ بال بال بچ گیا، کیونکہ یہ حادثہ اس کے محل میں داخل ہونے سے چند لمحے قبل واقع ہوا وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت تک روسی زار ملوکیّت پسند نکولس اوّل سمیت پیٹرز برگ کی سڑکوں پر محافظ دستے کے بغیر چلتے پھرتے تھے۔ وہ لوگوں سے علیک سلیک کرتے اور اپنے واقف کاروں بلکہ دہقانوں اور خُردہ فروشوں تک کے ساتھ بات چیت کرنے کو کھڑے ہو جاتے۔ اس کا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ زار پر حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ دفعتاً یہ صورت ہوئی کہ فراخ دل، ہمدردِ عوام الیگزنڈر جو "رہائی دہندہ زار" کہلاتا تھا پے در پے حملوں کا نشانہ بنا۔ پولیس کے پاس ان دیدہ دلیر، پُرجرأت دہشت پسندوں کو پکڑنے کے ذرائع نہ تھے۔ انتظامیہ پر خوف طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بڑی تنظیم سرگرم عمل ہے۔ (یہ تو بعد میں واضح ہوا کہ وہ گنتی کے چند افراد تھے) بلکہ کوئی بھاری اور دور رس منظّم سازش زار کی جان کے درپے ہے۔ الیگزنڈر کا پہلے چند حملوں سے بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ مگر ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو

ایک بم اس کی گاڑی کے نیچے اس وقت پھینکا گیا جب وہ کاسک محافظ دستے کے درمیان فوجی پریڈ دیکھ کر اپنے سرمائی محل کو واپس آرہا تھا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ جب دھوئیں کا بادل چھٹا تو راہگیروں نے دیکھا کہ کاسک خون میں نہائے پڑے تھے۔ زار کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ مگر وہ خود صاف بچ گیا تھا۔ وہ اپنے باقی ماندہ محافظوں سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں پاس کھڑے ایک دہشت پسند نے الیگزنڈر کے پاؤں میں دوسرا بم پھینکا۔ اس تازہ دھماکے سے زار کی ٹانگیں صاف اڑ گئیں اور محل میں لے جانے کے چند لمحے بعد وہ مر گیا۔

اس سانحہ نے خوشرُو اور قوی ہیکل الیگزنڈر سوم (جو باپ کے بعد وارث تخت ہوا) کے دل و دماغ پر گہرے تاثرات چھوڑے۔ مستقبل کی روسی تاریخ کا نقشہ اس نے پہلے ہی اپنے ذہن میں جما لیا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ پانچ افراد جنہوں نے الیگزنڈر دوم کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا تختۂ دار پر کھینچ دیے گئے کیونکہ یہ تو ہر ملک میں ہوتا، نیا شہنشاہ روا دارانہ انقلابی نظریات کو ان تمام آفات کا اصلی سبب قرار دے کر قدامت پسندی پر تُل گیا اور اپنی فرمانروائی کے پورے تیرہ سال اسی راستے پر چلتا رہا۔ نمائندہ حکومت کا منصوبہ جس پر اس کے والد کے دستخط ثبت ہو چکے تھے طاقِ نسیاں پر رکھا اور روسیوں سے کہا کہ اب اصلاحات کی امید نہ رکھو۔ الیگزنڈر دوم کے عہد میں جو آزادی اخبارات کو حاصل تھی وہ ختم کر دی اور اس پر سخت قدغن لگا دی۔ انقلابی رجحانات تو ایک طرف محض روادارانہ نظریات والوں کو بھی یا تو پولیس کی نگرانی میں دے دیا، یا شہر بدر کر دیا۔ یہودیوں پر سختی ہونے لگی۔ ۱۸۹۴ء میں الیگزنڈر سوم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نکولس دوم بھی اسی طریقے پر عامل رہا۔

اوّل اوّل تو یہ اقدام موثر معلوم ہوئے۔ دہشت پسندوں کی کارروائیاں

رک گئیں بجز اس ناکام حملے کے جو ۱۸۸۴ء میں الیگزنڈر سوم کی جان لینے کے لیے ہوا۔ باقی ہرطرف امن وامان ہوگیا۔ مگر یہ سب کچھ سطحی تھا۔ حقیقت میں ان دو زاروں کی پالیسی نے ان روادار اصحاب کو بھی برگشتہ کر دیا جو مرحوم الیگزنڈر کے حامی تھے۔ انقلابی تحریک ختم تو کیا ہونا تھی، اس کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہیں بلکہ بھڑک اٹھنے کے لیے خفیہ ایندھن حاصل کرتی رہیں۔ صدی کے آخر میں پہلے سے کہیں بڑھ کر دو مضبوط انقلابی جماعتیں "سماجی جمہوری" اور سماجی انقلابی" کے ناموں سے معرضِ وجود میں آئیں۔ اوّل الذکر نے اپنے نظریے کا پرچار صنعت کاروں میں کیا اور دوسری نے دہقانوں میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزدور اور دہقان انقلابی تحریک میں شامل ہونے لگے اگرچہ تعداد کم رہی۔

آخر صدی تک یہ نوبت پہنچی کہ دہقانوں کی اکثریت زاروں سے متنفّر ہوگئی۔ اب شخصی اقتدار کا فعال حامی صرف امراء کا قدامت پسند طبقہ ہی رہ گیا تھا۔ روس کے بیشتر طبقے غیر مطمئن تھے۔ یہ راز ایک بیرونی دھماکے نے فاش کر دیا۔

۱۹۰۴ء میں بہت سے قضیوں کی بناء پر جاپان نے مشرقِ بعید میں پورٹ آرتھر میں مقیم روسی بیڑے کے جنگی جہازوں پر حملہ کر دیا۔ روس جسے اس مصیبت بھری جنگ کی مجبوری آن پڑی تھی ہار گیا (سائبیریا سے گزرنے والی ریل کی سڑک ابھی نامکمل تھی اور مشرقِ بعید کے ساتھ روس کا سلسلۂ رسل و رسائل خراب تھا۔ پھر جاپانی اپنی سرزمین کے اڈّوں سے لڑ رہے تھے جس نے ان کا پلّہ بھاری کر دیا تھا) اس شکست نے گویا بارود خانے میں چنگاری پھینک دی۔ بے اطمینانی نے ایک زبردست انقلابی دھماکے کی صورت اختیار کر لی۔ روادار لیڈروں نے ایسی تقریروں سے جن کی انہیں پہلے جرأت نہ تھی رائے عامہ کی منتخب کردہ پارلیمان کا مطالبہ کیا۔ انقلابی گھات سے نکلے اور سرخ جھنڈوں پر "ملوکیت مردہ باد" کا

مقولہ لکھ کر مظاہروں میں مزدوروں کے رہنما بنے ۔ پھر کارکنوں اور دہقانوں کے نائبوں کی ایک سربراہ کونسل قائم کی ۔ وحشت پسندوں کے بموں سے سرکاری وزرأ اور افسران اعلیٰ ہلاک ہوئے ۔ ہڑتالوں سے ریلیں اور کارخانے بند ہو گئے ۔ انقلابی گروہوں اور پولیس کے مابین گلیوں اور سڑکوں پر باڑوں کے پیچھے سے جھڑپیں ہوئیں ۔ دیہات میں دہقانوں نے حکومت کی کمزوری بھانپ کر جاگیرداروں کے مکانوں میں آگ لگادی اور ان کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا ۔ تمام ملک میں فساد اور بدامنی پھیل گئی ۔

ان حالات میں فوج کا بڑا حصّہ شہنشاہ نکولس دوم کا وفادار رہا ۔ بڑے خون خرابے کے بعد انقلابی شورش پر قابو پایا گیا ۔ شورش کے فرو ہونے کی صورت بھی یہ ہوئی کہ زار نے ملک کو دستوری حکومت عطا کر دی ۔ ڈوما نام کی پارلیمان قائم کی گئی گو محدود اختیارات کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کو انتخابی ووٹ حاصل کرنے کی سہولت زیادہ ملی ۔ مگر روا دار طبقے نے یہ لنڈوری نمائندہ حکومت مل جانا بھی ایک بڑی فتح سمجھی ۔ بدنظمی ختم ہو گئی ۔

بہت جلد نئی مایوسیاں پیش آئیں ۔ نکولس دوم وسیع المطالعہ تھا ۔ کم فہم بھی نہ تھا ۔ مگر حکومت کی سخت ذمہ داریاں اٹھانے کی اس میں اہلیت نہ تھی ۔ نہ ہی اس میں اپنے باپ کا سا رعب و داب ، صاف گوئی اور مضبوط کردار تھا ۔ وہ کمزور دل ، ہٹ دھرم اور مذبذب تھا ۔ ملکہ سمیت دوسروں کا اثر جلد قبول کر لیتا تھا ۔ اس کا کردار الجھنوں اور اضداد کا مجموعہ تھا ۔ لیکن خاموش طبعی کی بدولت اپنی ان خامیوں کو وہ ظاہری سکون اور خوش اخلاقی کے پردے میں چھپائے رکھتا تھا ۔ اس کی پالیسی عدم بے استقلالی کا مرقع تھی ۔ انگیز نذر سوم کی طرح وہ شخصی حکومت پر یقین محکم رکھتا تھا ۔ ملک کو دستوری

حکومت اس نے محض ہنگامی حالات اور دباؤ کے تحت دی تھی ۔ دوسری طرف یہ کیفیت تھی کہ انقلاب کا پُرشور دور ختم ہو چکا تھا اور نئی "ڈوما" یعنی پارلیمان زیادہ تر آزاد خیال اور بنیادی تبدیلیوں کے طالبوں پر مشتمل تھی ۔ اس نے وسیع اصلاحات کا تقاضا کیا ۔ نکولس کو اس میں ایک نئی انقلابی شورش کا سامان نظر آیا اور وہ "ڈوما" کے اختیارات کم کرنے لگا ۔ اس اقدام سے بہت سے ایسے روا دار ارکان بھی برافروختہ ہو گئے جو پہلے اس کے ساتھ تعاون کے متمنی تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زار اور "ڈوما" کے مابین دائمی نزاع شروع ہو گیا ۔

پھر ۱۹۱۴ء میں پہلی عالم گیر جنگ چھڑ گئی ۔ روسی فوجیں بڑے طمطراق سے اس میں شامل ہوئیں اور انھوں نے حسبِ معمول داد شجاعت دی ۔ مگر بہت جلد انہیں اسلحہ اور توپ خانے کی کمی محسوس ہوئی اور واضح ہو گیا کہ روس کی حربی صنعتیں افسوسناک حد تک ناکافی تھیں ۔ اڑھائی سال کی سخت جنگ میں انھوں نے جرمنوں کو بہت کم بڑھنے دیا ۔ مگر اتنی کامیابی کے لیے بڑی قربانیاں دی گئیں ۔ توپوں اور گولوں کی کمی انسانی جانوں نے پوری کی ۔ پیٹرز برگ میں جس کا نیا نام پیٹروگراڈ رکھا گیا رفتار جنگ کے متعلق سخت بے اطمینانی کا اثر تھا ۔ یہ افواہیں بھی پھیل رہی تھیں کہ زار جرمنوں کے ساتھ صلح کی تجویزیں کر رہا ہے اور جرمن نژاد ملکہ الیگزنڈرا فوجی راز جرمنوں کو بتا رہی ہے ۔ بعد میں یہ افواہیں قطعاً بے بنیاد ثابت ہوئیں ۔ پھر بھی بہتوں نے یقین کر لیا اور "ڈوما" میں بھی یہ خبریں بہ آواز بلند سنائی گئیں جب یہ افواہیں سپاہیوں کے کانوں تک پہنچیں تو خندقوں میں ٹھٹھرتے اور مرتے ہوئے جانبازوں نے یوں محسوس کیا گویا وہ غداری سے اغیار

کے ہاتھ بیچے جا رہے ہیں۔

وزن کی زیادتی سے ریل گاڑیاں سامانِ رسد پیٹرو گراڈ میں تاخیر سے پہنچاتی تھیں۔ فروری ۱۹۱۷ء کے اواخر میں وہاں خوراک کی بے حد کمی شروع ہوگئی اور اس کمی نے روٹی کے لیے قطاروں میں کھڑے کارکنوں میں شورش اور بدنظمی پیدا کردی۔ رات کے وقت سنسان راستوں پر گولیاں بھی چلیں۔ محافظ فوج کا محفوظ دستہ ضبط ونسق قائم کرنے کے لیے بلایا گیا مگر اس نے گولی چلانے سے انکار کردیا اور کارکنوں کا ہمنوا ہوگیا۔ ایک دو دن میں یہ چھوٹا سا ہیجان وسیع بغاوت میں بدل گیا۔ باغیوں نے وزراء کو یکے بعد دیگرے گرفتار کرلیا۔ نکولاس خود بھی محاذِ جنگ اور پیٹرو گراڈ کے درمیان ریل کا سفر کرتے ہوئے واقعات کی لپیٹ میں آگیا۔ اس کے پاس "ڈوما" کے قاصد یہ پیغام لے کر پہنچے کہ تخت وتاج سے دست برداری کے سوا اور کوئی شے ملک میں امن وامان نہیں لاسکتی اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کہ ایک شخص بھی اس کا حامی نہیں رہا زار نے تخت سے دست برداری کے محضر پر دستخط کردیے۔ مگر ایسی سخت آزمائش کے لمحے میں بھی وہ ذرّہ بھر مشتعل نہ ہوا اور ضبط اور خوش اخلاقی برتی۔

ڈیڑھ سال کی قید کے بعد نکولاس اور اس کے اہل وعیال ایکاٹرن برگ (جو اب سورڈلاوسک کہلاتا ہے اور کوہستان یورال میں واقع ہے) میں قتل کردیے گئے۔ نکولاس کی تخت سے علیٰحدگی کے بعد قدیم روس باقی نہ رہا۔ انقلاب زوروں پر آگیا۔

باب ۰ ۷

اہلِ رُوس

انقلاب کے پہلے چند سالوں میں سفاکانہ قتل و غارت ، دہشت زدگی ، خانہ جنگی ، بیرونی مداخلت ، شدید قحط اور دیگر مصائب و آفات کا دور دورہ رہا ۔ روس نے بے انتہا مادّی نقصان اٹھایا اور لاکھوں جانیں تلف ہوئیں ۔

نکولس کی تخت سے دست برداری پر ڈوما کے روا دار اور اعتدالی سوشلسٹ عنصر نے ایک عارضی حکومت قائم کی جس کا سربراہ پہلے شہزادہ لووف اور بعد میں ایک سوشیلا وکیل کیرنسکی نامی ہوا ۔ حکومت چاہتی تھی کہ فرانس ، انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ مل کر جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھے اور ملک میں دستور ساز اسمبلی بنانے کے لیے عام انتخابات کا اہتمام کرے ۔ یہ اسمبلی فیصلہ کرے کہ جدید روس میں کس قسم کی حکومت، اقتصادی اور معاشرتی نظام رائج کیا جائے ۔

مگر یہ عارضی حکومت ہی صرف آٹھ ماہ چلی ۔ جنگ کے تھکے ہارے جوانوں نے زار کی علیحدگی کا یہ مطلب سمجھا کہ اب انہیں لڑنا نہ ہوگا ۔ چنانچہ یہ جوان جن میں اکثریت دہقانوں کی تھی جوق در جوق میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے تاکہ مالکان اراضی کو مار بھگائیں اور ان کی جاگیریں آپس میں تقسیم کرلیں ۔ بعض مقامات پر کارکنوں نے مالکوں کو نکال کر کارخانوں پر خود قبضہ کرلیا ۔ عوام کے گروہ ”اب سب کچھ جائز ہے“ کے نعرے لگاتے ہوئے لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوگئے ۔ عبوری حکومت کمزور

ثابت ہوئی۔ روز افزوں بدنظمی کا سدِ باب اس نے محض ہدایت کرنے تک محدود رکھا۔ یعنی لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ منتخب دستور ساز اسمبلی ہی اراضی کی اور دوسری اصلاحات رائج کرنے کی مجاز ہوگی۔

مگر قیامِ امن کے لیے یہ سب ناکافی تھا اور حالت یہ ہوئی کہ اس خفیف سی مدافعت پر بھی لوگ حکومت سے برافروختہ ہوگئے۔

اس اثناء میں "سوشلسٹ جماعت" کا ایک اور گروہ ابھرا جو کمیونسٹ یا بالشویک پارٹی کے نام سے ولاڈی میر لینن کی قیادت میں ہر دلعزیز ہو رہا تھا۔

ابتداء میں روس کی سوشل جمہوری پارٹی کا جو ۱۸۹۸ء میں قائم ہوئی بالشویک جزوِ اعظم تھے (لفظ بالشویک کے معنیٰ ہی اکثریت ہیں) پھر وہ اعتدالی سوشل جمہوری جماعت سے قطع تعلق کر کے علیحدہ پارٹی بن گئے۔

مستقل مزاج سینتالیس سالہ لینن ان کا رہنما بنا۔ وہ گنجا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں چوڑی تھیں اور منہ پر عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ عنفوانِ شباب سے ہی وہ انقلابی تھا اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قدیم روس کے قید خانوں اور ملک سے دور جلا وطنی میں گزارا تھا۔ قدرت نے اسے زبردست قوتِ فہم وادراک، دور اندیشی بے دریغ عزم کی صلاحیتیں بخشی تھیں۔ جملہ روسی اشتراکیوں کی طرح وہ کارل مارکس کا پیرو تھا جو انیسویں صدی کا جرمن نژاد فلسفی اور نظریۂ سوشلزم کو وضاحت سے پیش کرنے والا تھا۔ مگر اس نظریے میں لینن نے بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس کی جماعت تعداد میں کم مگر ضبط ونظم میں کامل اور اس کی بے چون وچرا اطاعت کرنے والی تھی۔ اس کے ارکان بڑے دلیر اور صاحبِ عزم تھے۔

اعتدال پسند اشتراکی دور رس اصلاحات کے خواہاں تھے مگر لینن ان سے بھی آگے بڑھ گیا۔ وہ پرانے معاشرتی نظام بلکہ خیالات کا قلع قمع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نصب العین

یہ تھا متمول طبقے سے تمام سرمایہ نقدی ہو یا اراضی، یا کارخانے سب چھین کر عوام کی (جو اب خود حکومت تھے)، ملکیت میں دے دے اور اس طرح پہلے روس میں اشتراکیت یا کمیونزم کا مکمل نظام قائم کر کے غیر ملکی کارکنوں کو اپنے اپنے ملکوں میں ایسے انقلابات لانے کی ترغیب دے۔

کارل مارکس کی طرح لینن بھی سرمایہ دار کو جونک سمجھتا تھا کیونکہ وہ مزدوروں سے ناجائز مشقت لے کر نفع کا بہت تھوڑا حصّہ انھیں مزدوری میں دے کر باقی سب اپنے پاس رکھتا تھا۔

لینن کے خیال میں سب سرمایہ دار خواہ روس کے ہوں یا انگلستان، جرمنی یا کسی اور ملک کے، ظلم میں برابر تھے۔ اس لیے عالمی انقلاب کی ضرورت تھی اور اشتراکیت تبھی مفید ہو سکتی تھی کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور کسی ایک ملک تک محدود نہ رہے۔

اس منصوبے کو عملی بنانے کے لیے لینن نے اپنی جماعت کی مختصر تعداد سے بے نیاز ہو کر ہر قیمت پر اقتدار کو ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا اسے یقین واثق تھا کہ اگر ایک مرتبہ اس کی جماعت نے روس پر اپنا تسلّط جما لیا تو کارخانوں کے مزدور خود ہی سمجھ لیں گے کہ یہ انہی کی بہبود کا جذبہ لے کر اٹھی ہے اور اس کی پوری تائید کریں گے یہ عوامی اقتدار کی حکمرانی ہوگی اور رفتہ رفتہ دہقانوں کا کم فہم طبقہ بھی ہم نوائی کرے گا۔

اس طرح انقلاب کے روز اوّل سے ہی لینن اور اس کی جماعت نے شعلہ بار تقریروں اور اخبارات میں لاتعداد جوشیلی تحریروں سے قوم کو اُبھارا کہ دستور ساز اسمبلی کے قیام کا انتظار کیے بغیر سپاہی فوج سے نکل جائیں۔ کسان جاگیریں جلد دیں اور مزدور کارخانوں پر جبراً قابض ہو جائیں۔ لینن پرچار کرتا کہ مزدوروں کو فرانسیسی یا انگریز سرمایہ داروں کے لیے جانیں دینے میں کوئی دل چسپی نہیں۔

بالشویکوں نے کرینسکی کی عارضی حکومت کی مذمت کی اور اسے لوگوں کو طوقِ غلامی پہنانے والی سرمایہ داروں کی حکومت کا نام دیا۔

مارچ ۱۹۱۷ء میں مزدوروں کی نمائندہ کونسلیں (۱۹۰۵ء والی کونسل کے نمونے پر) پیٹروگراڈ اور دوسرے شہروں میں قائم ہوئیں۔ بالشویکوں نے تیزی سے ان میں نشستوں کی بڑی تعداد حاصل کر لی۔ علاوہ بریں پیٹروگراڈ میں متعین فوجی دستے اور شہری مسلح کارکنوں کی سرخ پوش گارد بھی زیادہ سے زیادہ لینن کی طرف رجوع کر رہی تھی اس بدنظمی اور افراتفری کے عالم میں عارضی حکومت کی کون سنتا تھا۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں لینن نے عارضی حکومت کے خلاف کھلی بغاوت شروع کر دی بارڑوں کے پیچھے سے جنگیں ہونے لگیں۔ گولیاں چلیں۔ سرخ جھنڈے بلند ہوئے اور سرخ خون سڑکوں پر بہنے لگا۔ بہت کم فوج نے حکومت کا ساتھ دیا۔ سُرخ پوش بالشویک گارد، بحیرۂ بالٹک کے بیڑے کے ملّاح اور سپاہ نے سرمائی محل پر جو حکومت کا مرکز تھا حملہ کر دیا۔ کرینسکی اور اس کے بعض وزیر فرار ہوئے جو بچے وہ گرفتار ہو گئے۔ ماسکو اور دوسرے صوبائی شہروں میں بھی بالشویک کامیاب رہے اگرچہ سخت مزاحمت پیش آئی اور بہت جلد روس کا بڑا حصّہ (تمام نہیں) ان کے ہاتھ آگیا۔

اس سے ذرا پہلے دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہو گیا تھا۔ بالشویکوں کو اس میں ایک تہائی سے کچھ زیادہ ہی نشستیں ملیں۔ اکثریت اعتدال پسند اشتراکیوں کی رہی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ پیٹروگراڈ میں ہردلعزیز ہونے کے باوجود باقی ملک انہیں نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس سے لینن کو کوئی خلجان نہیں ہوا۔ جو نہی اسمبلی کا اجلاس ہوا، بالشویکوں نے جو موقع پر بخوبی حاوی تھے اسے توڑ دیا

اور بہت سے غیر بالشویک ارکان گرفتار کر لیے۔

پھر تو اشتراکی ان اجلاسوں میں شامل ہو گئے اور ان کے ذریعے سے کمیونسٹ پارٹی روس پر حکومت کرنے لگی۔ مقامی، شہری اور دیہی کونسلیں وقتاً فوقتاً اپنے نمائندے کانگریس میں بھیجتیں اور سب مل کر مرکزی کونسل منتخب کرتے۔ یہ کانگریس کو بنانے یا منظور کرنے کی مجاز تھی اور ملکی نظام چلانے کے لیے معتمدوں یا وزرا کا بھی انتخاب کرتی تھی۔ بالشویک صرف اپنے آپ کو یا اپنے ہمنوا مزدوروں اور دہقانوں کو ہی ان مقامی اور مرکزی کونسلوں کے رکن منتخب ہونے دیتے تھے۔ اس طرح عوام یا کہیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا اقتدار قائم ہوا۔

بالشویک غلبے کے کچھ مدت بعد سوویٹ حکومت نے تمام بینک، بینکوں کے سرمائے، کانیں، کارخانے، صنعتی مرکز، مکانات، ریلیں، ذخیرے، کاروباری تنظیمیں، جاگیریں (اگرچہ درحقیقت یہ دہقانوں نے پہلے ہی چھین لی تھیں) قبضے میں لے کر انہیں قومی ملکیت قرار دیا۔

ان بدامنی اور بدنظمی کے مہینوں میں جرمن محاذ پر روسی فوجیں تتر بتر ہو گئیں اور انتشار رونما ہوا۔ اس حالت میں بالشویک جنگ جاری رکھنا بھی چاہتے تو روس اس کا قطعاً اہل نہ تھا۔ بدیں وجہ ۱۹۱۸ء کے اوائل میں اشتراکیوں نے اپنے حلیفوں سے علیحدہ جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے ساتھ "برلیسٹ لٹاوسک" کے مقام پر صلح نامہ کر لیا۔ جس سے ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس بڑے چراغ پا ہوئے۔

سوویٹوں نے سرمائے کو قومی ملکیت بنا کر روس میں ایسا انتشار اور افراتفری پیدا کر دی جو عارضی حکومت کے زمانے میں بھی نہ ہوئی تھی۔ رُوبل (روسی سکہ) کی قیمت گر گئی۔ کارکن کام کی بجائے بیکار باتوں اور لڑنے

جھگڑنے میں وقت ضائع کر دیتے اور کارخانوں سے کچھ حاصل نہ ہوتا ۔ دہقان شہر والوں کو اجناس اور دیگر اشیائے خوردنی بیچنے سے انکار کر دیتے کیونکہ اس کی کچھ قیمت نہ رہی تھی ۔ شہریوں کو خوراک بہم پہنچانے کے لیے دہقانوں سے زبردستی اناج چھینا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان محروم غلے والوں ، معزول سیاسی جماعتوں ، کچھ علم دوست اور مہذب طبقے اور بعض کسانوں نے باہم مل کر اشتراکیوں کی مخالفت میں ایک مضبوط تحریک شروع کر دی ۔

شہروں میں بالشویکوں کے خلاف سخت غم و غصے کے اظہار کی تقریریں کی گئیں ۔ سرکاری دفاتر میں کلرکوں نے سوویٹوں کے کاغذات تلف کر دیے ۔ اور بعض اشتراکی قائدوں کو دہشت زدگی کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا ۔ خود لینن ایک اعتدال پسند اشتراکی خاتون ڈورا کیپلان کے ہاتھوں سخت زخمی ہوا ۔ بالشویکوں نے انتقامی جذبے سے سرشار ہو کر خونیں دہشت زدگی سے اس کا جواب دیا ۔ اعلیٰ طبقے کے افراد اور مختلف اشتراکی جماعتوں کے ارکان کو یرغمال کے طور پر ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کر لیا ۔ اور ہر کمیونسٹ پر حملے کے عوض سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اتارا ۔ دہقانوں کی متفرق بغاوتوں کو بھی سختی سے دبایا گیا ۔

۱۹۱۸ء کے آخر میں سوویٹوں کو شدید تر خطرہ لاحق ہوا ۔ غیر مطمئن عنصر مدتوں سے روس کی حدود پر جمع ہو رہا تھا ۔ ان میں بہت سے فوجی افسر تھے جنہوں نے سرخ نشان والی (جو انقلاب کا رنگ تھا) سوویٹ افواج کے مقابلے میں اپنی افواج منظم کیں اور "سرخ" کے برعکس انہیں "سفید" موسوم کیا ۔ سائبیریا میں "سفید" افواج کا قائد ایک قابل بحری افسر امیرالبحر کولچاک بنا ۔ شمالی قفقاز کی افواج جنرل ڈینی کن اور بیرن رانگل کی کمان میں آئیں "سفید"

۱۴۶ فوجیں بالٹک کے رقبے میں بھی تھیں اور آرکیبں کے نواح میں بھی۔ اب خانہ جنگی شروع ہوگئی "سفیدوں" کا نعرہ تھا کہ جرمنی کے ساتھ جنگ جاری رہے اور دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے۔ فرانس، برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ سوویٹوں کے عالمی انقلاب کے پرچار اور جرمنی کے ساتھ علیحدہ صلح نامے سے ناراض ہوکر سامانِ حرب سے سفیدوں کی مدد کرنے لگے۔ فرانس اور برطانیہ نے تو ڈینی کن اور دوسرے "سفید" قائدین کی امداد کو فوجی دستے بھی بھیجے اس نظام کا نام "حلیفانہ بیچ بچاؤ" ہوا۔

یہ خونی اور انتہائی کینہ پرور خانگی جنگیں دو سال سے اوپر ۱۹۲۰ء تک چلیں۔ بسا اوقات ہر دو طرف جنگی قیدی بھی تہ تیغ کر دیے جاتے۔ یقیناً فریقین میں کچھ ہنگامی مہم جُو۔ اور خود غرض اشخاص بھی تھے مگر بدقسمتی سے "سُرخوں" اور "سفیدوں" کی اکثریت نیک نیتی سے اپنے مقصد کی حامی تھی۔ اس لیے وہ برضا و رغبت جانیں نثار کرنے کو آمادہ تھے۔ ۱۹۱۹ء میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ فتح "سفیدوں" کے ہاتھ رہے گی۔ ڈینی کن کی جنوبی علاقے کی فوج پورے یوکرین پر غالب آگئی اور ماسکو سے سو میل کے فاصلے تک پہنچ گئی۔ مگر ایک اختلاف رونما ہوا "سفیدوں" نے دہقانوں کا جاگیروں پر جبراً قابض ہونا قبول نہ کیا اور دستور ساز اسمبلی کے قیام تک اس فیصلے کے التوا پر اصرار کیا زیادہ خرابی یہ ہوئی کہ بعض "سفید" سپہ سالاروں نے نکالے ہوئے مالکانِ اراضی کو پھر وہیں لا بسایا۔ اس لیے دہقان جو اکثر مقامات پر ان کے حامی و مددگار تھے منحرف ہو گئے۔ اس طرح عوامی تائید و تعاون سے محروم ہوکر "سفیدوں" نے شکست کھائی۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں بقیہ "سفید" یا تو مطیع ہو گئے یا روسی حدود کی طرف بھاگ گئے۔

"سرخوں" کے لیے بھی مشکلات تھیں کیونکہ انھیں کئی اور لڑائیاں پیش

آگیئں ۔ روسی زاروں نے ۱۷۷۲ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیانی عرصے میں بہت سی بے انصافیاں کی تھیں ۔ پروشیا اور آسٹریا کی ملی بھگت سے انہوں نے پولینڈ فتح کر کے آپس میں بانٹ لیا تھا ۔ بعد ازاں پولینڈ کے قبضے سے بقیہ روسی علاقہ نکال لینے کے علاوہ وارسا کا خالص پولستانی رقبہ بھی چھین لیا ۔ ۱۹۱۸ء میں جب حلیف افواج نے جرمنی اور آسٹریا پر فتح پائی تو آزاد پولینڈ نے دوبارہ جنم لیا ۔ مگر ۱۹۲۰ء میں اس کے اور سوویٹوں کے مابین پھر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے "سرخ" فوج میں مقابلے کی سکت نہ تھی ۔ "سفیدوں" کے ساتھ جنگوں نے اسے تھکا دیا تھا اس لیے وہ پولینڈ سے مات کھا گئی ۔ اب پولستانیوں کی باری تھی ۔ اپنے غلبے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ آگے بڑھے اور سوویٹوں سے وہ خالص روسی علاقے بھی لے لیے جن کے حصول کی روسی "وہشتناک" زار آئوان کے وقت سے جد وجہد کر رہے تھے ۔

لتھونیا جو پولینڈ کے ساتھ ہی روس میں جذب کر لیا گیا تھا اب آزاد ہو گیا ۔ اسی طرح نواح بالٹک میں رہنے والے استھونیوں اور لٹویوں نے بھی جو ابتدائی صدیوں میں سویڈن کے ماتحت تھے اور پیٹر اعظم کے بعد روسی رعایا بنے ، روس سے الگ ہو گئے اور فرانس اور برطانیہ کی تائید سے چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں بن گئے ۔ انجام کار فن لینڈ نے بھی جسے روس نے ۱۸۰۹ء میں سویڈن سے حاصل کیا تھا ۔ سوویٹوں سے برسرِ پیکار ہو کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ۔

جب تمام لڑائیاں ختم ہوئیں تو یہ عالم تھا کہ سوویٹ یونین کی تاب و طاقت ختم ہو چکی تھی ۔ مصیبت پر مصیبت یہ کہ خانہ جنگیوں کے زخموں ، دشمن فوج کے مطالبوں اور ۱۹۲۲ء کی خشک سالی کے تنکار ملک میں خوف ناک قحط پڑا اور یہ حادثہ ایسی الم ناک صورت اختیار کر گیا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو مجبوراً روس

کی مدد کرنی پڑی ۔ ہربرٹ ہُوور کی سربراہی میں امریکی امدادی محکمہ نے قحط زدہ بھوک کی ماری ہوئی آبادی میں تقسیم کرنے کے لیے روس کو خوراک بھیجی ۔ مگر اس امداد کے باوجود روس کے چالیس لاکھ باشندے بھوکوں مر گئے ۔

ان دھماکوں اور صعوبتوں کے ہجوم میں بھی لینن متزلزل نہ ہوا ۔ نہ ہی اس وقت جب متحدہ سوویٹ یونین آخری سانس لیتی نظر آئی ۔ اس اثناء میں وہ اشتراکی پارٹی کی کامیابی کی خاطر ہر ممکن مادی نقصان اٹھانے اور انسانی جانوں کی قربانی دینے کو تیار رہا ۔ بالآخر اس کی موت کے وقت یعنی ۱۹۲۴ء میں فتح صاف دکھائی دینے لگی ۔

اب کتنے ہی سال گزر چکے ہیں ۔ انقلاب کی اوّلیں افراتفری کا زمانہ مدّت ہوئی ختم ہوگیا اور اس ہل چل کے دوَر سے ایک بالکل بدلا ہوا نیا ملک نکلا جو آج سوویٹ یونین کی شکل میں منظر آ رہا ہے ۔

لینن کی وفات کے بعد متعدد بالشویک قائد حصول اقتدار کے لیے سخت جدوجہد کرنے لگے ۔ آخرکار ان میں سے ایک جوزف اسٹالِن کامیاب ہوا اور اپنی موت تک یعنی ۵ ، مارچ ۱۹۵۳ء تک بلا شرکتِ غیرے متحدہ سوویٹ کا مالک رہا ۔ اس کے مرنے کے بعد بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور میدان نکِتا خروشیف نئے زعیم کے ہاتھ رہا ۔

سوویٹ فوج میں اسٹالن جنرلیسمو یعنی سپہ سالار اعلیٰ کا بلند ترین رتبہ رکھتا تھا ۔ پھر وہ سوویٹ حکومت کا وزیر اعظم بھی تھا ۔ وہ اکثر "لیڈر" کے نام سے پُکارا جاتا تھا ۔ لیکن درحقیقت وہ اس سے بھی زیادہ اقتدار کا مالک تھا ۔ جرمنی کے ہٹلر اور اٹلی کے مسولینی کی طرح وہ روس کا آمر (ڈکیٹر) تھا ۔ اسٹالن کے اختیارات لامتناہی تھے ۔ یوں کہیے کہ کسی زار کو بھی اتنی طاقت حاصل نہ ہوئی

تھی۔ اسٹالن کی مدح سرائی بلکہ روسیوں کے باپ کی حیثیت سے اس کی پرستش کی تلقین تو سوویٹ اخباروں اور ریڈیو کا ایسا فرلیضہ تھا جو بن لکھے قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اصلیت تو یہ تھی کہ لوگ اس سے خائف اور متنفر تھے۔ وہ سخت بے رحم اور انتہا درجے کا شکی مزاج تھا۔ ہر اختلاف رائے رکھنے والے کو وہ غدار گردان کر تباہ کر دیتا۔ سوویٹ پولیس کے ہر جگہ موجود ایجنٹوں (''جی۔پی۔یو'' جو بعد میں ''ایم۔وی۔ڈی'' اور ''ایم۔جی۔بی'' کہلائے) کی جاسوسی اور دھمکیاں جن کا نتیجہ مسلسل پکڑ دھکڑ اور اکثر تختہ' دار تھا اس حکومت کے خاص گر تھے۔ دعویٰ تو دنیا کی سب سے ترقی پذیر حکومت ہونے کا تھا لیکن حقیقت میں یہ قرونِ اولیٰ کے ظلم استبداد کا نمونہ تھی۔

اسٹالن نے اپنا اقتدار ٹراٹسکی، زنوولیف، کامنیف، بخارن اور دوسرے اشتراکی زعماء کے ساتھ طویل اور شدید کشمکش کے بعد قائم کیا تھا۔ اس کشمکش میں اصولی اختلافات کے ساتھ رقیبانہ جوش بھی کار فرما تھا۔ سٹالن نے پارٹی کو ناپسندیدہ عناصر سے پاک کر کے ۱۹۳۶ - ۳۹ء کے انتقامی اقدامات سے اپنی فتح کی مُہر ثبت کر دی۔ ہزاروں کمیونسٹ اور وہ لوگ جنہیں وہ اپنے پوشیدہ دشمن سمجھتا تھا غداری، جاسوسی اور دوسری سرگرمیوں کے مجرم ٹھہرا کر گولی سے اڑا دیے گئے یا سائبیریا کے جبری مشقتی کیمپوں میں جلاوطن کیے گئے۔ ان میں متعدد اعلیٰ مرتبت سوویٹ حکام اور فوجی جرنیل بھی تھے۔

۱۹۵۳ء میں اسٹالن کی وفات کے بعد اشتراکی پارٹی اور سوویٹ یونین پر ضبط رکھنے کا کام پہلے تو اس کے سرکردہ نائب سپہ سالاروں خروشیف، میلنکاف، بیریا مارشل زوکاف، مارشل بلگانن کے ہاتھ آیا اور ان سب نے باہمی تعاون سے متحدہ حکومت چلانے کا حلف اٹھایا۔ مگر جیسا کہ لینن کی موت کے بعد ہوا تھا یہ اتحاد

رقابت میں بدل گیا رفیقوں یا رقیبوں کا سب سے پہلا شکار لیورنیٹی بیریا ہوا۔ خفیہ مقدمہ چلا کر اسے مجرم ٹھہرایا گیا اور گولی مار دی گئی۔ اسٹالن کے عہد میں وہ مدت تک سوویٹ پولیس کا خوفناک سربراہ رہا۔ اب اسے حکومت کے خلاف (درحقیقت رقیبوں کے خلاف) سازش کا مرتکب سمجھا گیا۔ مگر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا۔ یہ ڈرامائی سازشوں اور جوابی سازشوں کے نئے سلسلے کا آغاز تھا اور جب ان کا شکار ہو کر ۱۹۵۸ء تک اس کے رفقائے کار ایک ایک کر کے راستے سے ہٹ گئے تو خروشیف روس کا حقیقی فرماں روا بن گیا۔

اولاً رفقاء کی معیت میں اور بعد ازاں مختار کل ہونے پر خروشیف نے اسٹالن سے مختلف طریقہ اختیار کیا۔ بلاشبہ جس طرز حکومت کی قیادت میں روس زندگی بسر کر رہا ہے اس کے نصب العین میں فرق نہیں آیا۔ اس میں پارٹی کے قائد یا قائدین مختار کل ہیں۔ صرف ان کا استعمال پارٹی اور حکومت کے کل پرزوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ مگر جہاں اسٹالن نے جبر و تعدی اور دہشت سے کام لیا خروشیف نے مقابلتاً کچھ نرمی برتی اور وہ روسیوں کی اہم ضروریات پوری کرنے کا خواہش مند رہا۔

اسٹالن نے سوسائٹی کو ناپسندیدہ عنصر سے پاک کرنے کے نام سے جو دار و گیر اور قتل روا رکھے تھے وہ خروشیف کی عہد میں نہ رہے۔ بے قانونی، ناروا ظالمانہ جلاوطنیاں اور سولیاں جو اسٹالن کے وقت معمول بن چکی تھیں خروشیف نے انہیں حقارت سے دیکھا اور حق و انصاف پر سختی سے کاربند ہونے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سوویٹ حکومت کے لکھوکھا اصلی یا فرضی دشمن جنہیں اسٹالن نے جبری اسیری کیمپوں میں جکڑا ہوا تھا آزاد کیے گئے اور یہ کیمپ ختم ہو گئے۔ خروشیف نے اس نظریے کی بھی تردید کی کہ عوام کسی لیڈر کے پرستار

بن جائیں ۔ اس نے لوگوں کی کسی خاص ملازمت یا شہر کے ساتھ ذلت آمیز دل بستگی کو ختم کر دیا ۔ اس نے آزادی دی کہ سوویٹ شہری اپنی وسیع سرزمین کے جس شہر یا علاقے میں چاہیں نقل مکانی کریں ۔ ان وجوہ کی بنا پر عام طور پر خروشیف کی پالیسی کو سٹالین کے برعکس کہا جاتا ہے ۔ آخر میں اس نے ایسے اقتصادی منصوبے رائج کیے جن سے روسیوں کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا ۔ یوں تو سوویٹ طرز حکومت غیر جمہوری ہی رہا ۔ مگر خروشیف نے اس میں تھوڑا بہت انسانی حقوق کے احترام اور زیادہ نہیں تو چند ایک معاملات میں محکوموں کی رائے سننے کا رجحان داخل کر دیا ۔ مگر اس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کیونکہ خروشیف کی ہمدردی اور نرم دلی اس وقت تک ہی تھی کہ اس کے اپنے یا اشتراکی پارٹی کے اقتدار کو گزند نہ پہنچے ۔ ۱۹۵۶ء میں جب ہنگری کے عوام نے وہاں کی اشتراکی حکومت کے خلاف شورش کی تو اس نے بلاتامل سوویٹ فوجیں (جو وہاں دوسری عالمی جنگ کے بعد سے مقیم تھیں) مشین گنوں ٹینکوں ، اور آتشیں اسلحہ اور بارود سے لیس انہیں دبانے کے لیے بھیجیں ۔ اس اقدام سے تمام مغربی دنیا میں ہل چل مچ گئی اور غصے کی لہر دوڑ گئی (اب خروشیف کی زندگی اور اقتدار ختم ہوئے بھی عرصہ ہو گیا)

اس طرز حکومت پر غور کیجیے جس کے اندر آج روسی عوام زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ سوویٹ اشتراکیت کا اہم نقش یہ ہے کہ افراد آمدنی کے ذرائع پر مالکانہ حقوق نہیں رکھ سکتے ۔ آپ ایک مکان پر قابض ہو سکتے ہیں جب تک کہ آپ یا آپ کا خاندان اس میں مقیم رہے مگر اسے کرایہ وغیرہ پر دے کر کوئی مالی نفع نہ کمائیے ۔ نقدی سرکاری تمسکات ، موٹر کار ، گھر کا فرنیچر ، ملبوسات یا اور ضروریاتِ زندگی کا سامان رکھ سکتے ہیں ۔ لیکن کانیں ، کارخانے ، ریلیں ، مکانات اور اسی

نوعیت کی اور نفع رساں جائداد وغیرہ ملکیت بنانے کی اجازت نہیں۔ ہاں اگر مکان بنانا ہو تو قطعۂ زمین طویل مدت کے لیے اجارے پر لیا جاسکتا ہے لیکن خرید نہیں سکتے۔ آمدنی کے ایسے تمام ذرائع اصولاً پوری قوم کی اور عملاً ریاست کی ملکیت ہیں۔

افراد کسی نفع بخش کام کے لیے مزدور بھی ملازم نہیں رکھ سکتے۔ گھریلو کام کے لیے معاوضے پر خدمت حاصل کی جاسکتی ہے مگر ایسے کارکن نہیں مل سکتے جو قابل فروخت اشیاء تیار کریں کیونکہ کمیونسٹ نظریے کے مطابق یہ سرمایہ داری اور جلب منفعت ہوگی جو سوویٹ یونین میں قانوناً منع ہے۔ تمام صنعت اور ریلیں وغیرہ ریاست کی ملکیت ہیں اور ان میں کام کرنے والے سرکاری دفاتر اور فوج کے ملازمین کی طرح حکومت سے تنخواہیں پاتے ہیں۔ ہر سوویٹ شہری کسی نہ کسی کام میں لگنے کا حق رکھتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سوویٹ حکومت کا تمام صنعتوں کی مالک ہوتے ہوئے فرض ہے کہ ہر تندرست مرد اور عورت کو ملازمت بہم پہنچائے۔

کسان سرکاری ملکیت کی زمینیں دوامی پٹے پر لیتے ہیں۔ پھر بہت سے انہیں اشتمالی کھیت بنا لیتے ہیں۔ یعنی ہر گاؤں کے باشندے اپنے کھیت، مویشی اور دوسرے وسائل کو یکجا کر کے اکٹھے کام کرتے ہیں اور آمدنی کو اپنی اپنی محنت کے تناسب سے تقسیم کر لیتے ہیں۔ "اجتماعی کھیت" کے ہر رکن کا چھوٹا سا باغیچہ بھی ہوتا ہے جہاں وہ اپنے کھانے یا بیچنے کے لیے کچھ پھل اور ترکاریاں لگا سکتا ہے اور کچھ مویشی اور جانور بھی پال سکتا ہے۔ حکومت ٹریکٹر اور دوسرے زرعی آلات "اجتماعی کھیتوں" کو قیمتاً دیتی ہے۔ اس کے کارندے اور مقامی اشتراکی پارٹی کی تنظیمیں کاشتکاروں کو ہدایات دیتی ہیں کہ انھیں کس موسم میں کیا اور کیسے کاشت کرنا چاہیے۔ کاشتکار اپنی اجناس مقررہ بھاؤ پر صرف حکومت کو بیچ سکتے ہیں۔ پھر حکومت خود یہ اجناس شہریوں

کو فروخت کرتی ہے یا دساور کو بھیجتی ہے۔ اس مد سے حاصل کیا ہوا سرمایہ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسی سے روس کی مسلح فوج اور صنعتی ترقی وغیرہ کے مصارف پورے کیے جاتے ہیں۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیانی سالوں میں جب یہ اشتمالی کھیت بنائے جانے لگے تو کسانوں کی اکثریت برہم ہوئی اور سخت مدافعت پر اتر آئی۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر ایک دفعہ وہ اس قسم کی اشتمالیت میں پھانس دیے گئے تو آزاد کاشت کار نہ رہیں گے اور ان کی حیثیت سرکاری ملازمین یا بیگاریوں جیسی ہو جائے گی۔ اس بناء پر پورے روس میں کسانوں نے سخت شورشیں برپا کیں جو مظالم اور خونریزی سے دبائی گئیں لاکھوں کسان خاندان جلاوطن کر کے جبری اسیری کیمپوں میں بھیجے گئے۔ اتنی بھاری قیمت ادا کر کے سوویٹ روس کو دیہی سوشلزم حاصل ہوا۔

اشتراکی پارٹی نے روس کے قدرتی وسائل سے استفادہ کرنے اور انھیں ترقی دینے کو ہمیشہ بڑی اہمیت دی ہے۔ ۱۹۲۸ء کے بعد سے سوویٹ حکومت نے توسیعِ صنعت، نئے صنعتی کارخانے اور مرکزوں کی تعمیر، کانوں اور ریلیوں وغیرہ کے بہت سے پنج سالہ منصوبے بنائے ہیں جو ۱۹۵۹ء سے ہفت سالہ ہو گئے ہیں یہ سب اقدامات سوویٹ یونین کی اقتصادی ترقی کو تیز کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

کچھ نئی صنعتیں بھی معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ مثلاً ۱۹۱۷ء سے پہلے روس چند سو موٹر کاریں بناتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں یہ تعداد پانچ لاکھ ہو گئی۔ دو لاکھ ٹریکٹر بھی بننے لگے۔ خام لوہے کی پیداوار چالیس لاکھ سے پانچ کروڑ چھیاسی لاکھ ٹن ہو گئی تیل کی مقدار ستر لاکھ سے استی کروڑ بیرل ہوئی۔ جدید حربی اسلحہ، سامان پرواز مشین سازی اور دوسری صنعتیں وجود میں آئیں۔ کوئلہ، تانبا، تیل، المونیم اور دوسری معدنیات جو اب تک زیرِ زمین پوشیدہ تھیں یا ان کا تھوڑا بہت حصول ہوا تھا

اب ان کی ترقی پر بے حد توجہ دی جانے لگی۔ دریائے والگا اور کوہستان یورال کے درمیان تیل سے معمور نیا علاقہ دریافت ہوا ہے جسے اس معدنی دولت کی بناء پر دوسرا باکو کہتے ہیں۔ مصنوعی کھاد اور آبپاشی کے لاتعداد نئے طریقوں نے بنجر زمینوں کو بھی قابلِ کاشت بنا دیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات جو اظہر من الشمس ہے وہ یہ کہ سوویٹ روس نے روئے زمین پر جنگ اور امن ہر دو مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی پیدا کرنے والے عظیم ممالک میں مقام پایا ہے۔

ان تمام شاندار کارناموں کے باوجود سوویٹ یونین فولاد، تیل وغیرہ کے محاصل اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کے حصول میں ریاستہائے متحدہ امریکہ سے پیچھے ہے۔ مگر روسی منصوبہ بندوں نے مدّتوں پہلے سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ دوڑ لگانے اور اسے پیچھے چھوڑ کر بازی جیتنے کا نصب العین اپنے ملک کے سامنے رکھا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اسے پا لینے میں کامیاب ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ سوویٹ باشندوں کو ابھی تک زراعت میں پوری کامیابی نہیں ہوئی لیکن ماننا پڑے گا کہ سوویٹ یونین کی صنعتی ترقی قابلِ دید ہے اور امریکی اور یورپی مبصّر ہماری توجہ مندرجہ ذیل حقائق کی طرف مبذول کرتے ہیں!

ان کا پہلا دعویٰ تو یہ ہے کہ ان کارناموں میں سوویٹ سوشلزم کا جتنا حصّہ ہے اتنا ہی وقت کے تقاضوں کا بھی ہے۔ روسی فہیم اور محنتی لوگ ہیں۔ انقلاب سے پہلے بھی روس بڑی تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ ان عجیب وغریب واقعات کے حامل چالیس سالوں میں روسی صنعت جس قدر بڑھی ہے بلا شبہ کسی بھی اقتصادی نظام کے تحت اتنی ہی یا اس سے زیادہ ترقی ہر صورت میں کرتی۔ یہ بھی کہنا پڑے گا کہ روسیوں نے اس ترقی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے خون،

پسینہ، آنسو اور انسانی جانوں کی صورت میں بھاری قیمت ادا کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سوویٹ حکومت سے صنعتی انتظامات میں ناتجربہ کاری کی بدولت بڑی غلطیاں ہوئیں۔ اس نے بیش بہا سرمائے کا بے جا صَرف کیا اور قیمتی کارخانے غلط طریقے سے بنائے۔ پھر اپنی فاش غلطیوں کا الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی نیت سے اس نے روسی مہندسوں اور انجینئروں کی جماعتوں کو تباہ کاری کا عمداً مجرم ٹھہرا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مزید برآں صنعتی پیداوار بڑھنے کے باوجود سوویٹ یونین میں کپڑے، جوتے، فرنیچر، باورچی خانے کے برتن اور دوسرے روز مرہ استعمال کے سامان کی شدید کمی رہی۔ حالانکہ یہی چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کو آرام و آسائش بہم پہنچاتی ہیں۔ مگر انہیں تیار کرنے کی بجائے سوویٹ صنعت کاروں نے زیادہ تر مشینیں، موٹریں، ریل گاڑیاں، اسلحہ، ٹینک اور بندوقیں وغیرہ بنائیں جنہیں انسان نہ پہن سکتا ہے نہ ذاتی استعمال میں لاسکتا ہے۔

اس لیے سوویٹ یونین میں بیچارہ انسان بہت کچھ عزبت، فلاکت اور صعوبتوں کا شکار ہے۔ اس کے برعکس اعلیٰ کمیونسٹ زعماء ایسی شان و شکوہ اور عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ امریکی اور برطانوی سرمایہ دار رشک کرنے لگیں۔ اپنی تمامتر کوشش کے باوجود اشتراکی پارٹی اس واضح نصب العین کے حصول میں ناکام رہی ہے جو اس کے اوّلیں مفکروں اور بانیوں مثلاً کارل مارکس، لینن اور دوسروں نے انسانوں میں اقتصادی مساوات کے لیے تجویز کیا تھا۔ بلکہ عدم مساوات نے سخت قسم کا طبقاتی ٹکراؤ پیدا کر دیا ہے۔ آبادی کا بالائی طبقہ ماہرین تکنیک، سائنس دانوں، اشتراکی پارٹی کے زعماء اور سوویٹ حکومت کے اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے اور ان کا معیارِ زندگی عوام سے بہت بلند ہے۔

اقتصادی نظام کی حیثیت سے اپنی موجودہ صورت میں سوویٹ سوشلزم بظاہر

چند مفید خصوصیات رکھتا ہے۔ سوویٹ حکومت روس کی تمام صنعت اور قدرتی وسائل کی واحد مالک ہوتے ہوئے اپنے اہم منصوبوں اور فیصلوں کو جس تیزی اور زور شور سے عمل میں لاسکتی ہے وہ امریکہ جیسی جمہوری حکومت کے لیے ممکن نہیں کیونکہ یہاں نجی اور جماعتی مالکانہ حقوق کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے اور ضابطے کی طویل کارروائیوں کی رکاوٹوں سے گزرنا ہوتا ہے مگر روس کے اس مفید طریقے میں چند در چند قباحتیں بھی ہیں۔ اول تو یہ کہ ان فیصلوں کی تعمیل بھاری اسراف اور ضیاع کی حامل ہے یعنی اس میں روپے اور محنت کے بے جا صرف کے علاوہ انسان کے لیے صعوبتیں ہیں اور جانوں کا اتلاف ہے مزید برآں تمام افراد کو سرکاری ملازم بنا کر سوویٹ سوشلزم ان کے جذبۂ کفایت اختراعی صلاحیتوں کو کچل دیتی ہے۔ یہی دو عوامل ہیں جن پر مغربی جمہورتیوں کی خوشحالی کا انحصار ہے اور جو ہمیشہ اقتصادی ترقی کا سرچشمہ رہے ہیں۔

روس میں آباد مختلف نسلیں برابر سمجھی جاتی ہیں۔ سوویٹ یونین میں ہر عظیم نسلی گروہ ایک علیحدہ وفاقی جمہوریہ ہے۔ اسی طرح روسی جمہوریہ (جس کا بڑا حصہ یورپی روس اور سائبیریا ہے)، یوکرین، سفید روس، جارجیا، آرمینیا تاجکستان، قزاخستان، اور دوسری جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ چھوٹے گروہوں کی نسلیں مثلاً کازان اور تاتاری وفاقی جمہورتیوں کے اندر اپنی جمہوریتیں اور علاقے رکھتی ہیں۔ اپنی جمہوریت میں ہر نسل کی اپنی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ اس کی کتابیں اور اخبارات اسی زبان میں چھپتے ہیں اور تھیٹر وغیرہ اس کی اپنی ثقافتی روایات کا مظہر ہیں۔

یونین کی اعلیٰ ترین کونسل سمیت (جسے امریکی کانگریس سمجھیے) تمام کونسلیں عوام کی مخفی رائے دہندگی سے منتخب ہوتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت مدِ نظر رہے کہ

پوری سوویٹ یونین میں ابھی تک ایک ہی سیاسی پارٹی ہے یعنی حکمراں اشتراکی پارٹی اور اشتراکی کسی اور پارٹی کو وجود میں آنے ہی نہیں دیتے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے برعکس سوویٹ یونین میں جمہوری نظام نہیں۔ سیاسی آزادی کا راز آزادیٔ انتخاب میں مضمر ہے۔ اگر امریکی لوگ اپنی حکومت سے غیر مطمئن ہوں تو وہ انتخابات میں دوسری سیاسی جماعت کے امیدواروں کے حق میں رائے دینے کے مجاز ہیں۔ لیکن جب ایک ہی پارٹی ہو جیسی سوویٹ یونین میں اشتراکی پارٹی تو روسیوں کے لیے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں وہ اپنی رائے واحد فہرست کے اشتراکی امیدواروں ہی کو دے سکتے ہیں یا نام نہاد آزاد امیدواروں کے لیے جو کسی پارٹی سے متعلق نہ ہوں مگر ہر حالت میں اشتراکیوں کی منظوری انہیں حاصل ہو۔ مطلب یہ کہ اشتراکیوں کی فتح ہر صورت یقینی ہے۔ سوویٹ حکومت میں تمام ذمہ دار عہدے بھی اشتراکیوں ہی کے قبضے میں رہتے ہیں۔

ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ اہلِ روس اشتراکی پارٹی کے زیرِ فرمان (جو آمر کا درجہ رکھتی ہے) زندگی بسر کرتے ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ روسیوں کی تمام معیشت اور کاروبار کا انحصار اسی پارٹی پر ہے۔

۵۴-۱۹۵۳ء تک امریکی شہریوں کے برعکس روسیوں کی شخصی آزادی کو بھی قانون کی حمایت حاصل نہ تھی بلکہ کچھ عرصہ پہلے تو یہ کیفیت تھی کہ ہر شخص انجینئر ہو، کاریگر یا کسان اپنے کارخانے یا اشتمالی کھیت کے ساتھ وابستہ سمجھا جاتا تھا اور وہ حکام متعلقہ کی بلا اجازت انھیں چھوڑ کر کسی اور جگہ ملازمت نہ کر سکتا تھا۔ ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سوویٹ کا کوئی کارکن زیادہ مزدوری یا دوسرے مفاد کے لیے ہڑتال نہیں کر سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ سوویٹ یونین میں تمام صنعت کی مالک خود حکومت ہے۔

اس لیے ہڑتال حکومت کے خلاف جرم ہے۔ روس ابھی تک آزادیِ ذہن اور اظہارِ خیال کی مسرتوں سے آشنا نہیں۔

روس کے اخبارات، ادب، ریڈیو، سینما اور تعلیمی نظام سب اشتراکیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ عوام وہی کچھ پڑھ اور سُن سکتے ہیں جس کا پڑھنا اور سننا یہ پارٹی جائز قرار دے۔

سوویٹ شہریوں کے بچّے بھی پیشے کے انتخاب میں پورے آزاد نہیں۔ مثلاً خشت سازوں اور کان کنوں کی زیادہ مانگ ہو تو حکّام کو اختیار ہے کہ مطلوبہ تعداد میں بچّوں کو ان پیشوں کی تربیت لینے پر مجبور کریں خواہ وہ ماہرینِ تعمیر ہوں یا ڈاکٹر بننے کے خواہش مند ہی کیوں نہ ہوں۔ القصّہ صنعت اور زراعت دونوں حکومت کی ملکیت ہونے سے سوویٹ شہری اقتصادی اعتبار سے سراسر اشتراکی قیادت کی حکومت کا دست نگر ہے۔

عام روسی شہری کی زندگی بھی آرام دہ نہیں۔ وہ ایک اوسط امریکی سے کم کماتا ہے مثلاً ۱۹۵۹ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا عام صنعتی مزدور کپڑوں کا ایک جوڑا تین دن کی آمدنی سے بنا سکتا تھا۔ سوویٹ مزدُور کو ایسے ہی لباس کے لیے چھ ہفتے کی مشقت درکار تھی۔ عام امریکی ایک جوڑا جوتے یا اپنی شریکِ حیات کے لیے ریان کا ملبُوس حاصل کرنے کے لیے چار یا پانچ گھنٹے کام کرتا تھا۔ روسی کو ان اشیاء میں سے ایک سات دن کی اور دوسری چار دن کی عرقریزی سے ملتی تھی۔ اس لیے ماسکو میں عوام کا کچھ کثیف نظر آنا تعجب خیز نہیں۔ یہاں کا شہری معمولاً نکٹائی نہیں لگاتا۔ اس کا لباس بے ہنگم، بدقطع اور بہت کم اِستری کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ روس میں موٹر گاڑیاں اعلیٰ طبقے کا ہی حصّہ ہیں، مزدُوروں اور کسانوں

کو میسّر نہیں آسکتی۔

ماسکو کے بڑے ڈیپارٹمنٹ سٹور میں (بڑی دکان جہاں چیزیں مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے رکھی ہوتی ہیں) تجارتی اشیاء کا وسیع پیمانے پر اجتماع نظر آتا ہے جن میں جرابیں بنیان وغیرہ (جو پہلے کمیاب تھیں) برقی آلاتِ صفائی اور عمدہ کیمرے بھی ہیں۔ اتنی ترقی کے باوجود یہ سامان سب کی ضروریات پوری نہیں کرتا اور اشیاء کا معتدبہ حصہ معیار میں بھی اوسط درجے کا ہے۔ شاید یہ صحیح ہو کہ تجارتی مال میں کثیر المقدار اور سستی شے کتابیں ہیں۔ ہر موضوع کی کتابیں کلاسیکی ادب اور شطرنج کے رسالوں سے لے کر سیاسی پروپگنڈہ اور ایٹمی سائنس تک سوویٹ والے بڑی تعداد میں شائع کرتے ہیں کیونکہ روسیوں کو مطالعے کا بے حد شوق ہے۔

اشتراکی پارٹی کا فلسفہ ہمیشہ کی طرح اب بھی مادّیت پرستی اور الحاد ہے اشتراکی حسبِ معمول مذہب پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے اسٹالن کے عہد سے ہی کلیسا کے خلاف وہ وحشیانہ غارت گری چھوڑ دی تھی جو انھوں نے سوویٹ حاکمیت کے اوائل میں ۱۹۱۸ء - ۳۹ تک روا رکھی تھی۔ کیوں کہ روسی سرزمین سے مذہب کی جڑوں کو اکھیڑ پھینکنا ناممکن ثابت ہوا۔ اگرچہ مقابلۃً کلیسا کم تعداد میں ہی کھلے ہیں (کیونکہ اشتراکیوں نے پہلے دور میں اکثر بند کر دیے تھے) مگر عبادت کے اوقات میں یہ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ روسی جو ابھی تک اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم ہیں اشتراکی حکّام کی طرف سے بلا مزاحمت عبادت کر سکتے ہیں۔

روسی سخت جان، صابر، فطرتی صلاحیتوں کے مالک، سخت کوش اور امن پسند لوگ ہیں۔ امریکیوں کی طرح وہ کھیلوں کے بھی شیدا ہیں۔

۱۹۵۸ء میں سوویٹ یونین میں ایک لاکھ اٹھانوے ہزار کھیل کی انجمنیں درج رجسٹر تھیں اور ان کے رکن دو کروڑ بیس لاکھ تھے۔ روس میں انتہائی ہر دلعزیز کھیل یورپی فٹ بال ہے۔ پھر ہلکی ورزشیں اور برف پر پھسلنا ہے۔ بہت سے روسی شام کا وقت شطرنج کھیلنے میں صرف کرتے ہیں۔ سترہویں صدی میں یورپی سیاحوں نے روسیوں کو شطرنج کا بہترین کھلاڑی پایا۔ عام سوویٹ شہری کی آمدنی کم تو ہے مگر حکومت سے اسے اور طرح بہت سے فائدے پہنچتے ہیں۔ مثلاً موسمِ گرما میں وہ اپنی تعطیلات کریمیا کے سمندری ساحل یا قفقاز کے صحت افزا مقامات میں واقع کسی راحت کدے میں (جو سابق متمول مالکوں کی جاگیریں یا مسکن تھیں) تھوڑے سے خرچ سے یا بلا خرچ بسر کر سکتا ہے۔

سوویٹ حکومت سعی بلیغ کر رہی ہے کہ نئی نسل کی نشو و نما اس طرح کی جائے کہ وہ جسمانی طور پر مضبوط، سوویٹ طرزِ حکومت کے وفادار مستعد کارکن، قابل انجینئر اور افسر بنیں۔ اس لیے یہ حکومت بالخصوص طبیعات اور تکنیک کی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتی ہے۔ کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹیوں تک اور علومِ عالیہ کی مختلف النّوع درس گاہوں کے قیام اور انہیں با ذوق جدید ساز و سامان سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

روسی بچّے ہرگز نازک مزاج یا عیش طلب نہیں بنائے جاتے۔ وہ تن دہی سے کام کرتے ہیں۔ چھ دن ہفتے میں سکول جاتے ہیں یعنی سال میں دس ماہ۔ نصاب تعلیم وسیع اور مدارس کا ضبط سخت گیر ہے۔ الجبرا اور ریاضی جیسے کٹھن مضامین چھوڑے نہیں جا سکتے ان کا پڑھنا لازمی ہے۔ طلباء کو ایک جماعت سے دوسری میں ترقی اپنے مضامین میں کما حقہ حاوی ہونے سے ہی مل سکتی ہے۔ واضح ہو کہ عموماً ہر نوخیز روسی حصولِ علم کا دلدادہ ہے مگر یہ اس لیے

نہیں کہ وہ فطرتاً تجسس کا مادّہ رکھتا ہے ۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ روس میں نجی صنعت کا فقدان ہے اور تعلیم زندگی کو بہتر بنانے کا واحد ذریعہ رہ جاتا ہے ۔

ماہر مغربی مبصرّوں کا کہنا ہے کہ سوویٹ کی تعلیمی سرگرمی بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے ۔ اولاً یہ کہ ناخواندگی کو ملک سے بالکل ختم کردیا گیا ہے ۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ ثانوی مدارس کے اعلیٰ صلاحیتوں والے ذہین اور پر اُمنگ گریجویٹوں کو ہی اس کا مستحق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑے بڑے وظائف اور دوسری مراعات حاصل کرکے سوویٹ یونین کی "علوم عالیہ" کی ساڑھے سات سو درس گاہوں میں داخلہ لیں اور یہ درس گاہیں ہر سال تین لاکھ پچاس ہزار مستند ماہرین خصوصی تیار کرتی ہیں جن میں ہر شعبے کے محقق سائنسدان یعنی مہندس، انجینئر، بنانات، حیوانات کیمیا، ایٹمی توانائی کے عالم، خلائی ماہرین، ڈاکٹر اور دوسرے دانشور شامل ہیں ۔ یہ تعداد اتنی عظیم ہے کہ کسی اور ملک میں اس کی مثال نہیں ملتی ۔

روسی سائنسدان اپنے علم وسیع کو نتیجہ خیز بنانا بھی جانتے ہیں ۔ روسیوں نے ۱۹۵۷ء کے اکتوبر نومبر میں خلائی مہم پر دو سیارّے (جنہیں روسی زبان میں اسپٹنک کہتے ہیں) بھیجنے کی پہل کی ۱۹۵۹ء میں چاند پر راکٹ اتارنے میں بھی اولیت کا سہرا روس کے سر تھا ۔ اسی طرح یہ بعض خطرناک اور نہایت پیچیدہ جراحی عمل شاندار کامیابی کے ساتھ کرکے اوروں پر سبقت لے گیا ۔ ان کوائف سے ہمارے بعض مفکر یقین کرنے لگے ہیں کہ سائنس اور تکنیک میں روسی مغربی دنیا کے بڑے اہم حریف ہیں اور امریکیوں کی نئی پود کو محنتِ شاقہ سے کام کرنا چاہیے تاکہ سائنسی تحقیق کے میدان میں اپنا مقام کھوکر پیچھے نہ رہ جائیں ۔

انقلابی دَور کے بیشتر حصّے میں سوویٹ روس اور مغربی طاقتوں کے تعلّقات

اچھے نہیں رہے اور بعض اوقات تو نازک صورت اختیار کر گئے۔ یاد رہے کہ مارکس اور لینن کو وثوق تھا کہ سوشلزم کا اشتراکی فلسفہ بالآخر پوری دنیا میں سرمایہ داری پر فتح پائے گا۔ اس بناء پر اشتراکیوں نے سوچا (شاید اب بھی ایسا ہی سوچتے ہیں) کہ عالمی انقلاب کے ذریعے اس امر کی تکمیل کی جائے یعنی دنیا کی ہر قوم کے مزدور، سرمایہ داروں اور حکومتوں کے خلاف بغاوتوں پر تُل جائیں۔

ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ١٩١٧ء سے سوویٹ حکومت نے بہ ظاہر "سرمایہ دار حکومتوں" کے ساتھ بھی شائستہ سفارتی تعلّقات قائم کیے لیکن اشتراکی کھلے بندوں ان حکومتوں کا قلع قمع کرنے کی (بعض اوقات رائے عامہ کے خلاف) تلقین کرتے ہیں۔ مزید برآں انہوں نے دنیا کے بیشتر ممالک میں ناروے اور ہندوستان سے لے کر ہسپانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا تک اشتراکی جماعتوں کے قیام اور اس نظام کو مستحکم کرنے میں مدد دی۔ پھر ان قائم شدہ اشتراکی جماعتوں نے اپنے اپنے ملکوں میں یہ پرچار کیا، انقلابی اور اس نوع کی دیگر ڈھکی چھپی یا کھلی تخریبی کارروائیوں میں حصّہ لیا۔

یہ عوامل بذاتِ خود سوویٹ حکومت اور مغربی اقوام کی حکومتوں کے درمیان بہت سی غلط فہمیوں کا سبب بنے۔ اسی پر اکتفا نہیں آپ کو معلوم ہے کہ نازی جرمنی، فسطائی اٹلی اور آخری مرحلے پر جاپان کے خلاف
١٦٠ جنگ میں سوویٹ یونین امریکہ کی حلیف بنی۔ روس کے عوام اس وقت حاجت مند تھے اور امریکہ نے اسلحہ، حربی سازو سامان اور مشینوں سے ان کی مدد کی سوویٹ حکومت نے اس نازک وقت میں حتمی وعدے کیے کہ سوویٹ یونین

مشرقی یورپ اور دوسرے علاقوں کو جرمنی کے پنجے سے چھڑا کر آزادی اور جمہوریت سے ہمکنار کرے گی۔ مگر جنگ فتح ہونے کے بعد اس نے اپنے حلفی وعدوں کا قطعاً پاس نہ کیا۔

ان سالوں میں زبردست تباہی مچانے والے اسلحہ یعنی "اے" اور "ایچ" بم، دُور رس بمبار ایٹمی توپوں والی منجنیقوں سے مُسلّح اشتراکی اور مغربی محاذ دونوں ہی ایک دوسرے کو بے اعتمادی اور پُرخوف نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ سوویٹ والے ہوں یا مغربی اقوام سبھی تہ دل سے محسوس کرتے ہیں کہ سرد جنگ اور بین اقوامی اسلحہ بندی کی بے تحاشا دوڑ کی روک تھام اشد ضروری ہے۔ مزید یہ کہ نئی اور پرانی دنیا کے باشندوں کو باہم پُر امن زندگی بسر کرنے کے لیے کوئی منصوبہ زیرِ عمل لانا چاہیے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ایسی حیاتِ باہمی کے انتظام میں کامیابی ممکن نہ ہو۔ پچھلے چند ۱۶۱
سالوں سے سوویٹ حکومت نے بتدریج ایک حد تک اہلِ روس کی حقیقی خواہشات کا احترام کرنا شروع کیا ہے۔ اس سے بعض مفکّر سمجھتے ہیں کہ سوویٹ حکومت کا جمہوریت کی طرف جتنا جتنا رُجحان بڑھتا جائے گا مغربی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے ہی دوستانہ ہوتے جائیں گے۔

اس میں شک وشبہ کی ذرّہ بھر گنجائش نہیں کہ روسی جنگ کے خواہاں نہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جنگ کیا ہے اور اس کی تباہیوں کا انھیں شاید ہر قوم سے زیادہ تجربہ ہے۔ بعض اندازوں کی رُو سے دوسری عالمی جنگ میں روس کے ایک کروڑ پچاس لاکھ نفوس تلف ہوئے۔ روسیوں کو گہرا احساس ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کی نئی جنگ پہلی لڑائیوں سے بدرجہا زیادہ خوف ناک اور تباہ کُن ہوگی۔ انھیں امید ہے کہ اقوامِ عالم کی باہمی رفاقت اور افہام وتفہیم

سے دائمی امن قائم ہو سکتا ہے اور اس تمنا میں وہ مستثنیٰ نہیں کیونکہ امریکی ہوں یا جرمن، ہسپانوی ہوں یا ملائی بلکہ روئے زمین کے تمام ہوشمند انسان ان کے ہم نوا ہیں۔

اشاریہ

اشاریہ میں جن صفحوں کا حوالہ درج ہے وہ کتاب میں حاشیے کا نمبر دیکھنے سے ملیں گے

بچّوں کے ناول

تصنیف : کمال احمد رضوی

ایک مکان دو دیواریں

ضخامت : ۱۴۲ صفحات قیمت : ۹۴ پیسے

ہونہار امجد نہایت شریر اور شوخ لڑکا ہے لیکن بلا کا ذہین بھی ہے۔ اس کی شوخی اور شرارت کا انجام ایک مکان میں دو دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں اور اسے بہت دُکھ جھیلنا پڑتے ہیں لیکن اس کی نیکی اور بلند کرداری تمام غلط فہمیوں کو دور کر دیتی ہے۔ پھر مکان کی دیواریں گر جاتی ہیں اور نہ صرف سارا گھر بلکہ تمام ملک اسے ایک ہی مکان محسوس ہوتا ہے۔ ایک نیک بچّہ کی نفسیات اور اس کے اخلاق اور اصلاحی پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کیے گئے ہیں۔

تصنیف : لطیف فاروقی

عقاب

ضخامت : ۱۱۲ صفحات قیمت : ۷۵ پیسے

یہ تاریخ اسلام کی ایک داستان ہے، جس کا تعلق موسیٰ بن نصیر سے اور بربر قبیلہ کے ایک فرد یعقوب سے ہے۔ موسیٰ بن نصیر کے سکول میں یعقوب جب اپنے بچّوں کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سردار حبیب سے تلوار چل جانے پر نوبت پہنچتی ہے لیکن علم کے شیدا یعقوب اور ان کے بچّے حالات پر اس طرح قابو پاتے ہیں کہ سارا قبیلہ پھر انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے اور یہ علم کی بدولت موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیادہ کے کئی مفتوحہ علاقوں کے حاکم بن جاتے ہیں۔ تقطیع ۵" × ۷½"

تصنیف : سیّد نظر زیدی

ضخامت ۱۱۳ صفحات قیمت : ۷۵ پیسے

اس تلوار کے حیرت انگیز کارنامے، جو آج سے سالہا سال پہلے غازیٔ اسلام صلاح الدین ایوبی کے

ہاتھوں انجام پائے، اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے عزم وہمت، جوش وولولہ اخلاق وکردار کی بلندی اور اسلام کی سچی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ تقطیع : ۵" × ۷½"

جاسوس تصنیف: ابوالحسن نعیمی

ضخامت : ۱۷۲ صفحات قیمت: ایک روپیہ ۱۲ پیسے

یہ ناول بچوں کے کھیل کود اور ہنسی دل لگی سے شروع ہوتی ہے لیکن کچھ غیر مذہب کے چالاک اور فریبی دوستی کے پردے میں ان کے دیس کی آزادی میں زہر ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مخالف طاقتوں کے جال پوشیدہ طور پر بچھاتے ہیں لیکن یہی کھلنڈرے بچے اپنی ذہانت کی بدولت اپنے ملک اور قوم کو دشمنوں کے خطرے سے بچا لیتے ہیں اور یہ پاک باطن سراغ رساں دشمن کے عجیب وغریب بھید کھولتے ہیں۔ نہایت دلچسپ جاسوسی ناول۔

بھرے جنگل میں تصنیف : کمال احمد رضوی

ضخامت : ۱۶۸ صفحات قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

یہ ایک بن بلاؤ اور ایک شکاری کی داستان ہے۔ نہایت دلچسپ، اور حیرت انگیز۔ یہ غلامی اور آزادی انسان اور حیوان کی اچھائی و برائی کے فرق کو ظاہر کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ انسان زور اور ظلم کے نشہ میں حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے اور بھرے شہر کو خوفناک جنگل بنا کر انسانیت کو بدنام کرتا ہے۔ حد درجہ مفید و نصیحت آمیز ہے۔ یہ مغربی زبان کی ایک ناول سے اخذ کی گئی ہے۔ تقطیع : ۵" × ۷½"

ہمت کرے انسان تصنیف: سیّد نظر زیدی

ضخامت : ۱۲۴ صفحات

یہ عرب کے ایک قبیلہ بنی عبدالقیس کے ایک کم سن زبیر کی داستانِ ہمت ہے۔ اس کمسن نے مثنّیٰ بن حارث اور خالد بن ولیدؓ کی فوج میں رہ کر جس طرح دادِ شجاعت دی اور بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا، تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس کے مطالعہ سے یہی سبق ملتے ہیں۔ تقطیع : ۵" × ۷½"

تصنیف : ادارہ تصنیف و تالیف

پانی کا شہر

ضخامت : ۱۲۰ صفحات قیمت : ۸۴ پیسے

یہ کہانی بچّوں کے لٹریچر کے مشہور انگریز مصنف ہنس انڈرسن کی پریوں کی داستان کا آسان ترجمہ ہے اس بات کو ذہن نشین کیا گیا ہے کہ دراصل سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ کوئی اپنی خوشی اور خواہش کو دوسرے کی خاطر قربان کر دے۔

تقطیع : ۵″ × ۱/۲ ۷″

تصنیف : ابوالحسن نغمی

جانِ عالم

ضخامت : ۱۴۰ صفحات قیمت : ۸۷ پیسے

فسانۂ عجائب۔ اُردو زبان کی ایک پرانی اور مشہور کہانی ہے، جو مرزا رجب علی بیگ سرور نے لکھی تھی۔ یہ ہے تو جن اور پریوں کی کہانی، لیکن اس کا نتیجہ اور مقصد نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ اس کی دلچسپی اور ہر دلعزیزی کا ہر شخص قائل ہے۔ اس لیے اسے بچّوں کی زبان میں از سر نو لکھوا کر شائع کیا گیا ہے، تاکہ بچّے بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھیں۔ نیکی اور بدی کا انجام جو اس کہانی کا مقصد ہے، وہ ان کے دلوں پر بیٹھ جائے۔

تصنیف : سیّد نظر زیدی

پہلا مجاہد

ضخامت : ۱۸۶ صفحات قیمت : ۱/۲۵

یہ فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ کی مشہور و معروف داستان ہے، جس میں اس کم سن سپہ سالار کی عزم و ہمّت اور جوش و ولولہ کی تصویر ناول کی شکل میں اتاری گئی ہے، نہایت سلیس اور صاف زبان میں۔ بے حد دلچسپ اور نہایت مفید۔

تقطیع ۵″ × ۱/۲ ۷″

مؤسسۂ فرینکلن کی چند مطبوعات

○

مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن غیر تجارتی ادارہ ہے۔ اس کا کام خود کتابیں چھاپنا اور فروخت کرنا نہیں۔ البتہ یہ ادارہ اچھی انگریزی کتابوں کے تراجم شائع کرنے میں پاکستانی ناشرین سے تعاون کرتا ہے۔ یہ اشتہار اور فروخت کا انتظام بھی صرف معاون ناشرین کی حوصلہ افزائی اور فائدے کے لیے ہے، کیونکہ اس طرح شائقینِ کتب کو بہ سہولت ایک ہی مرکز سے ہمارے سب معاون ناشرین کی کتابیں مل جاتی ہیں۔ اس فروخت کی پوری آمدنی آخرکار ناشروں ہی کو منتقل کر دی جاتی ہے۔

بچّوں کے لیے کتابیں

سورج کے ساتھ ساتھ (طبع دوم، باتصویر) ○

تصنیف : ہیرلڈ کورلینڈر

ترجمہ : عشرت رحمانی

اس مجموعے میں اقوامِ متحدہ کے ساٹھ ملکوں کی لوک کہانیاں شامل ہیں۔ بچّوں کو کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ ساری دنیا کے لوگ ایک جیسے ہیں۔ سب کے ارمان، سب کی خوشیاں اور سب کے غم ایک سے ہیں۔

صفحات : ۳۱۰ — قیمت : سات روپے پچاس پیسے

نیا گھر (باتصویر) ○

تصنیف : ہرمن و نینا شنائیڈر

ترجمہ : مولانا صلاح الدین احمد

اس کتاب میں بچّوں کی دلچسپی کے لیے موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ گھروں کے سائنسی ساز و سامان کی تصویروں کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔

صفحات : ۴۰ — قیمت : دو روپے

نٹ کھٹ ہاتھی بچہ (باتصویر)

تصنیف : لیونارڈ وائس گارڈ

ترجمہ : سیّدہ نسیم ہمدانی

یہ ایک ننھے مُنّے شریر ہاتھی کی کہانی ہے۔ اس کی ماں اسے نصیحتیں کرتی مگر وُہ ہمیشہ ایک کان سے سُن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔ لیکن ایک دن اسے اس کی سزا بھگتنا پڑی۔ رنگین تصاویر اور آفسٹ کی چھپائی سے مزیّن۔

صفحات : ۴۰ قیمت : ایک روپیہ پچھتّر پیسے

بڑا ریچھ (باتصویر)

تصنیف : لِنڈ وارڈ

ترجمہ : اشرف صبُوحی دہلوی

کیا آپ نے کہانیوں کی کوئی ایسی کتاب دیکھی ہے جس میں عبارت کم اور تصویریں زیادہ ہوں، یعنی تمام کہانی تصویروں کے ذریعے سمجھائی گئی ہو؟ بڑا ریچھ ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ بچّہ کمسنی کے باعث کسی کہانی کے صفحے کے صفحے نہیں پڑھ سکتا لیکن اگر اُسے ایسی کتابیں دی جائیں جو کتابوں کے ساتھ ساتھ کھلونے بھی ہوں تو بچے کے مطالعے اور مشاہدے کا شوق بڑھے گا۔

صفحات : ۸۰ قیمت : تین روپے پچاس پیسے

خزانے کی تلاش (طبع دوم، باتصویر)

تصنیف : ولفرڈ بروِنسن

ترجمہ : شبلی ایم۔ کام

یہ ایک نوعمر لڑکے پیٹو کی بہادری کے کارناموں کی کہانی ہے۔ اس کے دادا چاندی اور فیروزے کے زیورات بنا کر بیچتے تھے۔ پھر اچانک لڑائی چھڑ گئی اور فیروزے کی تمام کانیں بند ہوگئیں اور ساتھ ہی پیٹو کے دادا کا کاروبار بھی۔ لیکن بہادر لڑکے نے تہیّہ کر لیا کہ وُہ ضرور فیروزے کی کسی خفیہ کان کا کھوج لگائے گا۔ پیٹو نے کان کا کس طرح کھوج لگایا اور فیروزے لے کر واپس گھر کس طرح پہنچا؟ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

صفحات : ۵۶ قیمت : دو روپے پچاس پیسے

سارہ کی بہادری (باتصویر)

تصنیف : ایلس ڈیلگلیش
ترجمہ : انتظار حسین

ایک آٹھ سالہ بھولی بھالی بچی کی بہادری کی یہ کہانی بالکل سچی ہے اور ڈھائی سو سال سے زندہ چلی آ رہی ہے۔ اس کے والد امریکا کے ایک اجنبی علاقے میں ریڈ انڈین باشندوں کے درمیان آباد ہونے کے لیے گئے اور سارہ کو بھی ساتھ لے گئے۔ گڑیوں سے کھیلنے والی اس ننھی مُنّی بچی نے بہن بھائیوں سے دُور رہ کر جس طرح مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کیا وہ ہر دَور کے بچّوں کے لیے سبق آموز ہے۔

صفحات : ۶۴ — قیمت : دو روپے

بوڑھا بگولا (باتصویر)

تصنیف : الزبتھ کوٹس ورتھ
ترجمہ : مولانا عبدالمجید سالک

یہ امریکا کے ایک سرحدی گاؤں میں رہنے والے بارہ سالہ لڑکے ڈیوی کراکٹ کی کہانی ہے۔ اسے بھی دوسرے بچّوں کی طرح لکھنے پڑھنے کا شوق تھا لیکن اس کے باپ نے اُسے ایک اکھڑ اور بے رحم گلہ بان کے پاس نوکر رکھا دیا۔ کس طرح اس نے اپنے تعلیم کے شوق کو پورا کیا اور ایک دن کانگرس کا ممبر بنا؟ بے حد دلچسپ اور سبق آموز۔

صفحات ۴۰ — قیمت : دو روپے

خوراک کی کہانی (باتصویر)

تصنیف : فرینک جیوپو
ترجمہ : شوکت تھانوی

تاریخی زمانے سے پہلے کا انسان کس طرح پیٹ بھرتا تھا اور بعد کے زمانے میں انسان کو خوراک حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جدّ و جہد کرنی پڑی ہے؟ اس حیرت انگیز ترقی کی یہ داستان بڑے دلچسپ اور پُرلطف انداز میں پیش کی گئی ہے۔

صفحات ۴۸ — قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

دُنیا پر پہلی نظر (باتصویر)

تصنیف : جین بنڈک
ترجمہ : سیّدہ نسیم ہمدانی

چھوٹے بچے جب اپنے گردوپیش دُنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو قدرت کے کارخانے میں بہت سی چیزوں کے متعلق ان کے دل میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً چاند کیوں چمکتا ہے؟ پودے کیوں اُگتے ہیں؟ برف کیوں پڑتی ہے؟ ——— اس کتاب میں ایسے سوالوں کے جواب اس انداز سے لکھے گئے ہیں کہ بچے کھیل ہی کھیل میں بہت کچھ سمجھ جاتے ہیں۔

صفحات ۶۸ قیمت : دو روپے

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (باتصویر)

تصنیف : منرو لیف
ترجمہ : مولانا عبدالمجید سالک

یہ تصویر دار کتاب کھیل ہی کھیل میں بچوں کو کرۂ ارض پر انسانی تاریخ کے بنیادی واقعات سے آگاہ کردے گی اور اس طرح ابتدا ہی سے ان کے ننھے ننھے دلوں میں تاریخ کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔

صفحات ۶۰ قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

بڑے سے بڑا چھوٹے سے چھوٹا (باتصویر)

تصنیف : ہرمن اور نینا شنائیڈر
ترجمہ : ابوالحسن نغمی

ذرا بتائیے تو دنیا میں سب سے بڑی چیز کونسی ہے؟ پہاڑ؟ سورج؟ نہیں، پہاڑوں اور سورج سے بھی بڑی ایک اور چیز ہے جو آپ تقریباً روز ہی دیکھتے ہیں مگر اس کے متعلق شاید آپ کی معلومات بہت کم ہیں۔ یہ تصویر دار کتاب اسی طرح کی دلچسپ چیزوں کے متعلق لکھی گئی ہے۔

صفحات ۴۰ قیمت : چار روپے

آیئے دوست بن جائیں (باتصویر)

تصنیف : ولیم سی ۔ مینجر
ترجمہ : سید وقار عظیم

دوستی کے لفظ اور معنی سے کون آشنا نہیں ؛ اور کون ہے جسے زندگی میں دوست کی ضرورت پیش نہیں آتی، لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ دوستی کے رشتے پر انسانی فطرت اور اس فطرت کی نفسیاتی کیفیتیں کس کس طرح اثرانداز ہوتی ہیں ! دوست اور دوستی کے حقیقی مفہوم ہی کی اس کتاب میں وضاحت کی گئی ہے ۔ ایک نازک اور پیچیدہ موضوع کو بچّے کے لیے انتہائی آسان بنا دیا گیا ہے ۔

صفحات ۶۲ — قیمت : ایک روپیہ پچھتّر پیسے

تم اور تمھارے مسائل (باتصویر)

تصنیف : ایچ ۔ ایچ ۔ ریمرز
ترجمہ : سیّد سبطِ حسن

نوعمروں کے اُن مسائل کا مفصّل جائزہ جن کا تعلق جسمانی نشوونما ، والدین کے ساتھ تعلقات اور گھر سے باہر کے لوگوں سے تعلقات سے ہے ۔

صفحات ۹۱ — قیمت : ایک روپیہ پچھتّر پیسے

پولیانا (باتصویر)

تصنیف : ایلینر ایچ ۔ پورٹر
ترجمہ : فہمیدہ نیاز احمد

ایک کمسن لڑکی کی یہ پُرتاثیر اور خیال انگیز کہانی دنیا کی مقبول ترین داستانوں میں سے ایک ہے ۔ وُہ خوش رہنے کا کھیل کھیلا کرتی تھی جس سے اس نے ساری بستی کو خوش رہنا سکھا دیا ۔ اس کا طریق یہ تھا کہ ہر بات پر اور ہر کام سے خوش رہنے کا پہلو نکالا جا سکتا ہے ۔ اس کمسن لڑکی اور اس کے خوش رہنے کے طریق کی وجہ سے اس دل پسند کہانی میں رُلانے ، ہنسانے اور چونکانے کی ایک ایسی کیفیت ہے کہ لوگ اسے ہمیشہ پسند کریں گے ۔

صفحات : ۳۲۸ — قیمت : چھ روپے

تمھارا جسم کیونکر کام کرتا ہے؟ (باتصویر)

تصنیف : ہرمن وینینا شنائیڈر
ترجمہ : خلیق ابراہیم خلیق

یہ دنیا بہت سی عجیب و غریب مشینوں سے بھری پڑی ہے لیکن آپ کے جسم سے زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز مشین کوئی نہیں۔ انسانی مشین کے کل پرزوں سے واقفیت حاصل کرنے میں یہ کتاب آپ کو مدد دے گی۔

صفحات ۱۶۰ — قیمت : چار روپے پچاس پیسے

تمھاری تندرستی (طبع دوم، باتصویر)

تصنیف : جے روز ویل گیلاگر
ترجمہ : مولانا عبدالمجید سالک

ہر شخص تندرست رہنے کا خواہشمند ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب سے ضروری معلومات حاصل کیجئے۔

صفحات ۷۲ — قیمت : دو روپے

میرے اندر کیا ہے؟ (باتصویر)

تصنیف : ہربرٹ ایس۔ زم
ترجمہ : غلام رسول مہر
نظر ثانی : ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان

انسانی جسم کے متعلق بچّوں اور بڑوں کے لیے ایک مفید پُر از معلومات مختصر کتاب۔ خوبصورت رنگین تصاویر سے مزیّن۔ صفحات ۳۴ — قیمت : ایک روپیہ پچاس پیسے

انوکھی کہانیاں

تصنیف : نیتھنیل ہوتھورن
ترجمہ : شاہد احمد دہلوی

مصنف نے یونانی صنمیات کے سات مشہور و معروف قصّوں کو بچّوں اور نوجوانوں کے لیے اس خوبی سے

بیان کیا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ہی زمانے کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔

صفحات ۲۶۹ قیمت : پانچ روپے

○ کیوں اور کس طرح : عام سوالوں کے سائنسی جوابات ○

تصنیف : ولیم سی۔ ورگرا ——— ترجمہ : علی ناصر زیدی

کئی سوال ایسے ہوں گے جنھیں سن کر آپ نے تعجب ضرور کیا ہے مگر ان کا جواب تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کتاب میں ایسے ہی تقریباً چار سو سوالوں کے جواب سائنسی اُصُولوں کی روشنی میں دیے گئے ہیں۔

صفحات : ۳۳۷ ——— قیمت : آٹھ روپے

سائنس باتوں باتوں میں ○

تصنیف : کارلٹن جون لنڈ

ترجمہ : علی ناصر زیدی

اس کتاب میں ستر کے قریب سادہ اور دلچسپ تجربات ہیں۔ ان تجربات کے لیے ایسی چیزوں ہی سے کام چل جاتا ہے جو عام طور پر ہمارے گھر میں پائی جاتی ہیں۔

قیمت : چار روپے

بنیادی سائنس کا سلسلہ

کتابت، طباعت، کاغذ کے لحاظ سے اس سلسلے کی کتابیں پاکستان میں بے مثال ہیں اور اس لحاظ سے بہترین یورپی اور امریکی کتابوں کے مقابلے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ آفسٹ کی چھپائی خاص طور سے ایران اور مصر کے چھاپہ خانوں میں کرائی گئی ہے۔ تقریباً ہر صفحے پر رنگا رنگ تصاویر جواہرات کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ یہ کتابیں معلوماتی ہونے کے

علاوہ بچّوں کے لیے گراں بہا کھلونے بھی ہیں۔

ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

کتاب	مصنف	مترجم
زندگی منزل بہ منزل	برتھا مورس پارکر	مولانا صلاح الدین احمد
توہمات یا سائنس	"	" " "
پودوں کی دُنیا	"	پروفیسر محمود احمد خاں
بادل، بارش اور برف	"	مولانا صلاح الدین احمد
سائنس دان اور اس کے آلات	"	" " "
زمین کی بدلتی ہوئی سطح	"	" " "
مادہ، سالمے اور جوہر	"	مولانا صلاح الدین احمد و پروفیسر عبدالواحد
پودوں کے کارخانے	"	مولانا صلاح الدین احمد
زندہ اشیاء (طبع دوم)	"	" " "
روشنی (")	"	" " "
ہمارے جانے پہچانے جانور (طبع دوم)	"	" " "
حرارت (طبع دوم)	"	" " "
زمانہ قدیم کے جانور (طبع دوم)	"	" " "
برق (طبع دوم)	"	" " "
آواز	"	" " "
کشش ثقل	"	" " "
کیڑوں کی سماجی زندگی	"	" " "


روس
بحر منجمد شمالی
بحیرۂ بیرنٹس
فن لینڈ
بحیرۂ بالٹک
پولینڈ
رومانیہ
بلغاریہ
یوکرین
سفید روس
ماسکو
ترکیہ
ایران
افغانستان
بھارت
سنکیانگ
منگولیا
مانچوریا
سائبیریا
علاقۂ یاقوت
بحیرۂ کارا
جزیرہ نمائے تیمر
بحیرۂ مشرقی سائبیریا
بحیرۂ بیرنگ
بحیرۂ اوخوتسک
بحرالکاہل
بحیرۂ جاپان
الاسکا
امریکہ
جزیرۂ رینگل
بھیل بیکال
تاشقند
سمرقند
بخارا
کوہستان تیان شان
ہنگری سٹیپ

مرقعِ اقوامِ عالم

اِس سلسلے کی کتابوں کا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کو دُنیا کی برادری کی مختلف قوموں کی طرزِ زندگی اُن کی تاریخ اور ان کے ملکوں کے متعلق مستند اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ہر کتاب میں معلومات کے علاوہ خوبصورت اور دلچسپ تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے مصنّفوں نے یہ کتابیں متعلقہ ملکوں کی سیاحت کر کے بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہیں۔ اس لیے ان میں مندرج معلومات بہت مستند ہیں۔

سرزمین اور باشندے	تصنیف	ترجمہ
آسٹریلیا	بلنڈن	عبدالحمید قریشی
بلجیم	لوڈر	غلام رسول مہر
چین	سپنسر	علی ناصر زیدی
مصر	زکی نجیب محمود	ہاشمی فرید آبادی
انگلستان	سٹریٹ	علی ناصر زیدی
فرانس	بریگڈن	عبدالحمید قریشی
جرمنی	ویزکرش	عبدالحمید قریشی
یونان	گیاناگوس	عبدالحمید قریشی
ہالینڈ	بارنو	صادق علی دلاوری
انڈونیشیا	ڈیس سی سمتھ	ابوالحسن نغمی
اٹلی	ونوار	غلام رسول مہر
جاپان	واگان	غلام رسول مہر
سپین	لوڈر	ہاشمی فرید آبادی
ترکی	سپنسر	غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، لاہور، پشاور، حیدرآباد، کراچی